هٰذا بلاغ للنّاس
ماهنامہ
کراچی
البلاغ
سرپرست:
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

دارالعلوم کراچی کا ترجمان

مدیر اعلیٰ
محمد تقی عثمانی

مدیر انتظامی
خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

جلد ۲
شمارہ ۷

رجب المرجب ۱۳۸۸ھ
اکتوبر ۱۹۶۸ء

فی پرچہ: ۵۶ پیسے • سالانہ: ۶ روپے • غیر ممالک سے: ۱ پونڈ سالانہ • ہوائی ڈاک سے: ۲ پونڈ سالانہ

ڈاک کا پتہ: ماہنامہ "البلاغ" - دارالعلوم کراچی - فون ۳۸۱۱۷

ہندوستانی خریدار مندرجہ ذیل پتہ پر چندہ ارسال فرما کر ڈاکخانہ کی رسید ہمیں بھیج دیں رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائیگا
مولانا ظہور الحسن صاحب خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو-پی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ذکر و فکر

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مد ظلہم

ادارۂ تحقیقات اسلامی

الحمد للّٰہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

ادارہ تحقیقات اسلامیہ پاکستان میں جس مقصد کے لئے قائم کیا گیا وہ یہ تھا کہ بیسویں صدی کے مشینی دور، ایجادات، اور صنعت و تجارت کی نئی نئی پیچیدہ صورتوں اور تیز رفتار ذرائع مواصلات اور ڈاکٹری و سرجری کی نئی تحقیقات نے مسلمانوں کے لئے زندگی کے ہر شعبے۔ اقتصادیات، معاشیات و سیاست ملکی اور دفاعی معاملات میں، پھر معاشیات کے ہر میدان میں مذہبی اور قومی حیثیت سے بہت سے نئے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں جو عرصۂ دراز سے مسلمانوں کی راہ ترقی میں حائل ہیں۔

پاکستان کی سب سے بڑی اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ایک ترقی پذیر ملک و قوم کی حیثیت سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان مسائل کا ایسا حل تلاش کیا جائے جو ایک طرف اسلامی احکام سے متصادم نہ ہو اور دوسری طرف ان عصری تقاضوں کو پورا کر سکے جو ایک ترقی پذیر ملک کے لئے ضروری ہیں۔

یہ ایک ایسا مقصد تھا جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں اور پاکستان کی حکومت کئی وجہ سے اس کی زیادہ مستحق تھی کہ وہ اس کا بیڑا اٹھائے، اس لئے ہر طرف اور ہر طبقے سے اس مقصد کی تحسین کی گئی اور ادارہ قائم ہو گیا۔

اہل بصیرت علماء اسلام انگریزی دور حکومت کے زمانے میں بھی اس کی ضرورت سے غافل نہ تھے مگر مغربی اور لادینی اصول پر چلے ہوئے نظام معاش کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کے تو وسائل موجود نہ تھے صرف آشنا کر سکتے تھے کہ نظام معاش کے موجودہ ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے بھی قرآن و سنت کے اصول کے ماتحت دی ہوئی سہولتوں اور گنجائشوں سے کام لے کر مسلمانوں کے لئے جس قدر سہولت پیدا کی جا سکتی ہے اس سے کام لیں، محقق علماء امت نے ہمیشہ اس فریضہ کو ادا کیا، گذشتہ ایک صدی کے محقق علماء کی تصانیف اور فتاویٰ اس پر شاہد ہیں۔

یہ کہنا کہ علماء وقت کے تقاضوں سے بے خبر ہیں یا وہ ان تقاضوں کی طرف توجہ دینا نہیں چاہتے، محقق اور اہل بصیرت علماء امت کے حالات اور تصانیف سے بے خبری کا نتیجہ ہے جس کا بڑا سبب بہت سے ادھوری تعلیم والوں کا اہل علم کے نام سے معروف

ہو جانا اور ناواقف عوام کا دین کے تمام معاملات میں ان پر اعتماد کر لینا ہے۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے قائم ہوا تو بجا طور پر اہل علم واہل دین کو یہ توقع قائم ہوئی کہ یہ ادارہ دنیا کے مروجہ اور موجود نظام میں ایسی متبادل صورتیں تجویز کر سکے گا جو وقت کے تقاضوں کو پورا بھی کر سکیں اور اس زمانے میں قابلِ عمل بھی ہوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی ——— اور حکومت اپنے خداداد وسائل سے اُن کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے گی۔

مگر افسوس . . . . کہ یہ ادارہ ابتدا ہی سے کچھ ایسے ہاتھوں میں پڑ گیا جن کے ذہن اسلام سے زیادہ مغربی تصورات پر ایمان رکھتے ہیں، یہ لوگ اگر اپنی نیت میں مخلص بھی ہوں تو ان کے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی دوستی اور خدمت بس یہ تھی کہ جو کچھ یورپ کی طرف سے آئے اسلام اور قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق بنا دیں اس کے لئے کتنی ہی تاویلات بلکہ تحریفات سے کام لینا پڑے سب کو گوارا کیا جائے۔

ان کے تحقیقی مقالے اس پر شاہد ہیں کہ انھوں نے خالی الذہن ہو کر کبھی یہ نہیں سوچا کہ قرآن کیا کہتا ہے بلکہ فکر رہی کہ ہمیں قرآن کی زبان سے کیا کہلوانا ہے جس کے لئے ہر جائز و ناجائز تاویل و تحریف سے کام لے کر اپنے نزدیک اسلام کی خدمت انجام دے دی۔

اس کے سابق ڈائرکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے تو نئے مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے اسلام کی بنیادی مسائل کے بخیے اُدھیڑنے اور اجماعی اور قطعی مسائل کو مشکوک اور مختلف فیہ بنا دینے میں ہی اپنی توانائی صرف فرمائی۔ وحی الٰہی، نبوت و رسالت، نماز پنجگانہ، نصاب زکوٰۃ، قربانی اور ذبیحہ، شراب کی حلت، نکاح و طلاق کے مسائل کو اپنا میدانِ کارزار بنا کر مسلمانوں میں سخت اضطراب اور بے چینی پیدا کر دی جس نے عوام کو حکومت کی طرف سے بدگمانی کے مواقع فراہم کئے اور عوام و حکومت کے درمیان ایسے وقت ایک خلیج حائل کر دی جبکہ ملک کو انتہائی وحدت و یگانگت کی ضرورت تھی، اختلافی مسائل کو اگر وہ واقعی بھی ہوتے اس وقت مؤخر کر دینا ضروری ہوتا۔

اس وقت جبکہ حکومت نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا استعفا قبول کر کے عام مسلمانوں کا مطالبہ پورا کرنے میں ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے اور اب یہ ادارہ ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے ملک و ملت کی ہمدردی و خیر خواہی کے تقاضے سے ضروری معلوم ہوا کہ اس ادارے کے فرائض کی ادائیگی اور اس کے مفید و مقبول بنانے کے لئے اس کے طریق کار کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔

ملک و ملت کے جو مسائل اس ادارہ کا سبب قیام اور وقت کے تقاضے کہلاتے ہیں ان کا حل تلاش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کا صحیح تجزیہ کیا جائے، اپنے غور و فکر اور علم و بصیرت کی حد تک میرا خیال یہ ہے کہ ان مسائل کے دو حصے ہیں۔

پہلا حصہ تو وہ مسائل ہیں جو حقیقت کے اعتبار سے وقت کا کوئی تقاضا نہیں بلکہ وہ مصنوعی تقاضا ہیں

گئے کہ انگریزوں کی لادینی حکومت نے صرف اپنے قومی امتیازات کو قائم رکھنے کے لئے اپنے قومی مزاج کے مطابق کھیل اور تفریح سے کر عام معاشرت۔ رہن سہن، طعام و لباس، میل ملاقات، میں پھر حکومت کے اداروں میں ایسے قواعد اور قوانین جاری کر دیئے جو مشرقی تہذیب اور اسلامی معاشرت سے قطعاً بیگانہ بلکہ متضاد ہیں، ان کے یہاں ستر پوشی، حیا و شرم، مرد و عورت میں محرم و غیر محرم کا امتیاز کوئی اہمیت نہیں رکھتے جبکہ مشرق کا مزاج خصوصاً اسلام کی تعلیمات اس سے سراسر مختلف ہیں اگر آج ہم اپنی قومی غیرت کا احساس زندہ ہو اور ہم اپنے قومی امتیازات کو یہ سمجھتے ہوئے زندہ کرنے کی فکر میں لگ جائیں کہ جو قوم اپنے خاص امتیازات قائم نہیں رکھ سکتی اس کو اس دنیا میں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں دیا جا سکتا تو ان تمام چیزوں کو بیک وقت تبدیل کر دینے سے بھی کسی اقتصادی، معاشی، معاشرتی کام میں ادنیٰ سا خلل نہیں پڑتا۔ ادنیٰ غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ ان چیزوں کو وقت کے تقاضے اور قومی ترقی کے لئے ضروری سمجھ لینا درحقیقت ہماری نظر کا فریب تھا، معلوم نہیں مغربی اقوام کی مزاج شناسی اور ان کی قومی رسوم کو کسی ملک و قوم کی ترقی کا معیار قرار دے دینا کہاں کی منطق ہے! کیا موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ ممالک چین وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے نہیں کہ انھوں نے مغربی علوم و فنون تو ہم سے زیادہ سیکھے مگر اپنے قومی امتیازات کو ان کی بھینٹ نہیں چڑھایا جس کے نتیجہ میں انھوں نے ایک زندہ قوم کی حیثیت میں دنیا سے اپنا لوہا منوالیا۔

ادارہ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان غلط رسموں اور بیحیائی کی معاشرت کے نتائج بد اور ان سے پیدا ہونے والے اخلاقی جرائم اور بدامنی اور قتل و غارت تک پہونچنے والے اثرات سے خود اپنی قوم کو بھی آگاہ کرے اور مغربی اقوام کو بھی، ـــــ اور اس کی بجائے اسلام کی پاکیزہ اور سادہ معاشرت کی تبلیغ میں اپنے پورے وسائل سے کام لے۔ اپنے ملک میں بتدریج ایسی رسوم کو مٹانے کی جد و جہد کرے، اگر ایسا کر لیا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ مغرب کے اہل عقل و دانش بھی ہم سے سبق سیکھیں اور اپنی غلط کاریوں سے رجوع کریں۔

مسائل کا دوسرا حصہ وہ ہے جن کا تعلق ہمارے اقتصادی، معاشی اور دفاعی معاملات سے ہے جن میں ہمیں بین الاقوامی سطح پر کام کرنا ناگزیر ہے! ان میں ہم ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اپنا نظام زندگی نہیں چلا سکتے۔

ایسے مسائل میں ادارے کو دو کام کرنا ضروری ہیں:-

اول یہ کہ جہاں تک موجودہ زندگی کے ڈھانچے میں معمولی اور جزوی تبدیلیوں سے زندگی کے ہر شعبے میں کام چل سکے ان میں علوم جدیدہ کے ماہرین کی امداد سے ایسی متبادل صورتیں تجویز کی جائیں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں اور بین الاقوامی سطح پر قابل عمل ہوں، پھر حکومت اپنے وسائل سے ان کو ملک میں رائج کرنے کی کوشش کرے، اسی کے ساتھ حالات زمانہ کا تجربہ رکھنے والے اہل تحقیق علماء کی امداد سے اسلامی تعلیمات کے اصول و فروع میں اسی کے بتلائے ہوئے طریق پر اس نظر سے غور کیا جائے کہ ایسی وقتی ضرورتوں کی صورت میں کس حد تک سہولت دی جا سکتی ہے، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ادارہ کا سربراہ کوئی ایسا عالم ہو جو علوم قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی مہارت کے ساتھ فنون جدیدہ میں بھی مہارت رکھتا ہو، پھر اس کو ہدایتی اصول کے

طور پر اس کا پابند کیا جائے کہ وہ عالمگیر مسائل میں اپنی انفرادی رائے کو پوری امت پر مسلط کرنے کے طریقے سے ہمیشہ اجتناب کرے بلکہ ملک کے دوسرے ماہرین اور اہل فتویٰ علماء کے مشورے اور تعاون کے ساتھ مسائل کا حل تلاش کرے کہ یہی طریقہ شرعاً بھی مقبول ہے اور عقلاً بھی اسی طریقے سے یہ ادارہ پورے ملک بلکہ بیرون ملک میں بھی اپنا اعتماد قائم کر سکتا ہے، اور مفید خدمات انجام دے سکتا ہے۔ واللہ الموفق والمعین،

یہ مسائل بلاشبہ نہایت دانشمندانہ غور و فکر اور تحقیق و نظر کے محتاج ہیں اور ان کا مؤثر اور مفید حل تلاش کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے، لیکن اب تک ان مسائل میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ اس نے قرآن و سنت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کی بجائے یہ طے کر لیا تھا کہ مغربی نظامِ زندگی سراسر حق و صواب ہے اگر اس کے قائم کئے ہوئے راستوں سے ہم ذرہ برابر بھی ہٹے تو ہماری ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ اس طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس ادارے کی تمام توانائیاں اس بات پر صرف ہوئیں کہ مغربی افکار کا جوں کا توں لیکر اس کے مطابق ثابت کیا جائے، خواہ اس کے لئے قرآن و سنت کے ساتھ کیسا ہی سلوک کیوں نہ کرنا پڑے۔

حالانکہ درحقیقت تحقیق کا یہ راستہ ہر اعتبار سے غیر معقول، خطرناک اور امت مسلمہ کے لئے سخت مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایسا مذہب نہیں ہے جس کا زندگی کے جیتے جاگتے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنا ایک مخصوص نظامِ فکر و عمل رکھتا ہے جو بنیادی طور پر مغرب کے نظامِ زندگی سے بالکل الگ ہے، کرنے کا کام یہ ہے کہ وقت کے تمام مسائل کا اسلام کے اس مخصوص نظام کی روشنی میں ایسا حل نکالا جائے جو موجودہ زمانہ میں قابل عمل بھی ہو اور اسلام کے مزاج کے مطابق بھی۔

ہماری زندگی میں بیشمار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں آزادانہ غور و فکر کر کے تھوڑی سی تبدیلی کر لی جائے تو وہ نہ صرف اسلام کے مطابق ہو سکتی ہیں بلکہ انسانیت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں، ادارہ تحقیقات کا اصل کام یہ ہے کہ وہ زندگی کے مغربی ڈھانچے کو جوں کا توں برقرار رکھ کر اسلام میں تبدیلی نہ کرے، بلکہ اسلام کو اس کی اصلی شکل میں برقرار رکھ کر زندگی کے مغربی ڈھانچہ میں ایسی تبدیلیاں تجویز کرے جن پر عمل کر کے مسلمان ایک باعزت اور خوددار قوم کی طرح ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکیں۔ مثال کے طور پر ادارۂ تحقیقات اسلامی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ سود کو حلال قرار دینے کے لئے کھینچ تان کرنے کے بجائے اپنے محققین کی توانائیاں اس تحقیق میں صرف کرے کہ موجودہ مالیاتی نظام کو سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر کس طرح چلایا جا سکتا ہے؟ بیمہ کے مقاصد کو سود اور قمار سے آزاد کر کے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ حکومت کو سرمایہ کی فراہمی کے لئے بلا سود اسکیمیں کیا کیا ہو سکتی ہیں؟ ——— !

اسی طرح اس کا فرض ہے کہ تجارت و صنعت کے جو نئے نئے معاملات روزمرہ پیدا ہوتے رہتے ہیں، پہلے سے انہیں جائز و حلال یا ناجائز و حرام فرض کئے بغیر پوری غیر جانبداری اور دیانت داری کے ساتھ اس بات کی تحقیق کرے کہ ان کے بارے میں قرآن و سنت کا واقعی حکم کیا ہے؟ اگر وہ قرآن و سنت کی رو سے ناجائز معلوم ہوں تو قرآن و سنت میں تحریف و تاویل کا دروازہ کھولنے کے بجائے ان معاملات کی ایسی متبادل صورتیں تجویز کرے جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق ہوں۔

کوئی شک نہیں کہ یہ کام محنت چاہتا ہے، لیکن محنت کے بغیر دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا، ادارۂ تحقیقات کو چاہئے وہ ہر علم و فن کے ماہرین کا پورا تعاون حاصل کرے، اور انہیں اس بات کا موقع دے کہ وہ مغرب کی اندھی تقلید پر مجبور ہونے کے بجائے اپنی خداداد ذہانت اور بصیرت سے ایسی متبادل تجاویز پیش کر سکیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی ہوں اور موجودہ زمانہ میں زیادہ مفید اور مؤثر بھی۔

پھر اس کام کے لئے ایک نہایت ضروری بات یہ ہے کہ عالمگیر مسائل میں محض انفرادی رائے سے کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے جب بھی کسی مسئلہ کی تحقیق مقصود ہو، اس میں ملک کے تمام اہل بصیرت اور معتمد علماء سے پوری نیک نیتی کے ساتھ مشورہ کیا جائے اور ان کے مشورے اور تعاون سے مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے سوالنامے بھی جاری کئے جا سکتے ہیں، اور ضرورت کے مواقع پر معروف اہل علم کو یکجا بھی کیا جا سکتا ہے تاکہ باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعہ کسی صحیح نتیجے پر پہنچا جا سکے،

اسی طرح جو مسائل جدید علوم و فنون سے متعلق ہوں، ان میں جدید علوم کے ماہرین سے اسی طریقے پر استصواب ہونا چاہئے تاکہ عملی طور پر بہتر سے بہتر صورت سامنے آ سکے لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر شخص سے وہ کام لیا جائے جس کا وہ اہل ہو۔ اور اس سے اسی معاملے میں مشورہ کیا جائے جس میں اس کی مہارت معروف ہو اور قوم اس پر اعتماد کرتی ہو۔

لیکن یہ تمام کام اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب اس ادارے میں ایسے افراد کو جمع کیا جائے جو قرآن و سنت کا وسیع و عمیق علم رکھتے ہوں دین کے مزاج سے پوری طرح باخبر ہوں، اور ان کے دل میں امتِ مسلمہ کے مسائل کا واقعی حل تلاش کرنے کی سچی تڑپ اور لگن ہو۔ نیز اس ادارے کا سربراہ کسی ایسے شخص کو مقرر کیا جانا چاہئے جو قرآن و سنت کے علم میں مہارت اور پختگی رکھنے کے ساتھ جدید علوم سے بھی باخبر ہو۔ اور اس پر امت یہ بھروسہ کر سکتی ہو کہ وہ قرآن و سنت میں تحریف کرنے کے بجائے ملک کے دوسرے اہل بصیرت اور مستند علماء کے مشورے سے ملک و ملت کی صحیح خدمت انجام دے سکے گا۔

اگر یہ ادارہ اس طرز پر قائم ہو گیا، اور اس نے اپنے کام کا رخ درست کر لیا تو انشاء اللہ یہ پوری قوم کی امنگوں کا مرکز بن سکے گا اور اس کے ذریعہ تاریخ ساز کارنامے انجام دئے جا سکیں گے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہمارے ارباب حل و عقد کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس ادارے کی تشکیل جدید اس طرح کر سکیں جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید ہی مفید ہو، اور اس کے بعد تمام مسلمان افتراق و انتشار کی افسوسناک صورتِ حال سے نجات پا کر یکسوئی اور یک جہتی کے ساتھ تعمیری خدمات انجام دے سکیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز:۔

سُورَةُ النَّحل

مکیۃ وھی مائۃ وثمان وعشرون ایۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سورت کا نام سورہ نحل اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر قدرت کی عجیب و غریب صنعت کے بیان کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اس کا دوسرا نام سورۂ نعم بھی ہے (قرطبی) نعم بکسر نون نعمت کی جمع ہے۔ اس سورت میں خاص طور پر اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے۔

اتیٰ امر اللہ فلا تستعجلوہ ط سبحانہ وتعالیٰ عما یشرکون ۵

آپہنچا حکم اللہ کا۔ سو تم اس میں جلد بازی نہ کرو۔ وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

اس سورت کو بغیر کسی خاص تمہید کے ایک شدید وعید اور ہیبتناک عنوان سے شروع کیا گیا جس کی وجہ مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں قیامت سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو غالب کرنے اور مخالفوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے ہمیں تو یہ کچھ بھی ہوتا نظر نہیں آتا اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "آپہونچا حکم اللہ کا تم جلد بازی نہ کرو"۔

حکم اللہ سے اس جگہ مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول سے کیا ہے کہ ان کے دشمنوں کو زیر و مغلوب کیا جاوے گا اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور عزت و شوکت حاصل ہو گی۔ اس آیت میں حق تعالےٰ نے ہیبتناک لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ حکم اللہ کا آپہونچا یعنی پہونچنے ہی والا ہے جس کو تم عنقریب دیکھ لوگے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں حکم اللہ سے مراد قیامت ہے۔ اس کے آپہونچنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کا وقوع قریب ہے اور پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قیامت کا قریب ہونا یا آپہونچنا بھی کچھ بعید نہیں رہتا (بحر محیط)

اس کے بعد کے جملے میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو حق تعالیٰ کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں، یہ کفر و شرک ہے اللہ تعالےٰ اس سے پاک ہیں (بحر)

اس آیت کا خلاصہ ایک وعید شدید کے ذریعہ توحید کی دعوت دینا ہے اگلی آیت میں دلیل نقلی سے توحید کا اثبات ہے۔

ينزل الملائكة بالروح من امره على من يشاء من عباده ان انذروا انه لا اله الا انا فاتقون ﴿۲﴾

وہ فرشتوں کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل فرماتا ہے۔ یہ کہ خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ سو مجھ سے ڈرتے رہو۔

لفظ روح سے مراد اس آیت میں بقول ابن عباس رضؓ وحی اور بقول بعض مفسرین ہدایت ہے (بحر) مضمون آیت سے یہ بتلایا گیا کہ عقیدہ توحید تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے۔ اس کے بعد کی آیتوں میں اسی عقیدہ توحید کو عقلی طور سے حق تعالےٰ کی نعمتیں پیش نظر کر کے ثابت کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے

خلق السموات والارض بالحق تعالیٰ عما یشرکون ﴿۳﴾ خلق الانسان من نطفة فاذا هو خصيم مبين ﴿۴﴾ والانعام خلقها لكم فيها دفء ومنافع ومنها تاكلون ﴿۵﴾ ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون ﴿۶﴾ وتحمل اثقالكم الى بلد لم تكونوا بالغيه الا بشق الانفس ان ربكم لرءوف رحيم ﴿۷﴾ والخيل والبغال والحمير لتركبوها وزينة ويخلق ما لا تعلمون ﴿۸﴾

آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے بنایا۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔ انسان کو نطفہ سے بنایا پھر وہ یکایک کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہو گیا۔ اور اسی نے رپالتو) چوپائے بنائے۔ ان میں تمہارے لئے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے کھاتے بھی ہو۔ اور ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ ان کو شام کے وقت (گھروں میں) لاتے ہو اور جبکہ صبح کے وقت چھوڑ دیتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ بھی ایسے (دور) شہر میں لیجاتے ہیں جہاں تم جان کو محنت و مشقت میں ڈالکر ہی پہونچ سکتے تھے واقعی ہمارا رب بہت شفقت اور رحمت والا ہے۔

لغات کی تشریح خصیم خصومت سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں جھگڑالو۔ انعام نَعَم بفتح نون کی جمع ہے چوپایوں میں سے اونٹ، بکری، گائے کو انعام کہا جاتا ہے (مفردات راغب) دِفء گرمی اور گرمائی حاصل کرنے کی چیز۔ کو دفء کہا جاتا ہے مراد اون ہے جس کے گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ تریحون رواح سے اور تسرحون سراح سے مشتق ہے چوپائے جانوروں کے صبح کے وقت چراگاہ کی طرف جانے کو سراح اور شام کو گھر میں واپس آنے کو رواح کہا جاتا ہے۔ شق الانفس جان کی محنت و مشقت۔

خلاصہ تفسیر ان آیتوں میں تخلیق کائنات کی عظیم نشانیوں سے حق تعالےٰ کی توحید کا اثبات ہے اول تو سب سے پہلی مخلوق آسمان اور زمین کا ذکر فرمایا اس کے بعد تخلیق انسان کا ذکر فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مخدوم کائنات بنایا ہے۔ انسان کی ابتداء ایک حقیر نطفے سے شروع ہو کر ایک قوی اور فصیح و بلیغ انسان بننے تک کا ذکر کر کے فرمایا فاذا ھو خصیم مبین یعنی جب اس ضعیف الخلقت انسان کو طاقت اور قوت گویائی عطا ہوئی تو خدا ہی کی ذات و صفات میں جھگڑے نکالنے لگا۔

انسان کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد ان اشیاء کی تخلیق کا ذکر فرمایا جو انسان کے فائدے کے لئے خصوصی طور پر بنائی گئی ہیں۔ اور قرآن کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے۔ اور

عرب کی معیشت کا بڑا مدار پالتو چوپاؤں اونٹ، گلے، بکری پر تھا اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا والانعام خلقہا پھر انعام سے جو فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں ان میں سے دو فائدے خاص طور سے بیان کر دیئے ایک لکم فیہا دفء یعنی ان جانوروں کے اُون سے انسان اپنے کپڑے اور کھال سے پوستین اور ٹوپیاں وغیرہ تیار کر کے جاڑے کے موسم میں گرمائی حاصل کرتا ہے دوسرا فائدہ ومنہا تاکلون یعنی انسان ان جانوروں کو ذبح کر کے اپنی خوراک بھی بنا سکتا ہے اور جب تک زندہ ہے ان کے دودھ سے اپنی بہترین غذا پیدا کرتا ہے دودھ دھی، مکھن، گھی اور ان سے بننے والی تمام اشیاء اس میں داخل ہیں۔ اور باقی عام فوائد کے لئے فرما دیا ومنافع یعنی اور بے شمار منافع اور فوائد انسان کے جانوروں کے گوشت، چمڑے، ہڈی اور بالوں سے وابستہ ہیں۔ اس ابہام واجمال میں ان سب نئی سے نئی ایجادات کی طرف بھی اشارہ ہے جو حیوانی اجزاء سے انسان کی غذا، لباس، دوا، استعمالی اشیاء کے لئے اب تک ایجاد ہو چکی ہیں یا آئندہ قیامت تک ہوں گی۔

اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ایک اور فائدہ عرب کے مذاق کے مطابق یہ بیان کیا کہ وہ تمہارے لئے جمال اور رونق کا ذریعہ ہیں۔ خصوصاً جب وہ شام کو چراگاہوں سے تمہارے مویشی خانوں کی طرف آتے ہیں یا صبح کو گھروں سے چراگاہوں کی طرف جاتے ہیں کیونکہ اس وقت ان مویشی سے مالکان کی خاص شان وشوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

آخر میں ان جانوروں کا ایک اور اہم فائدہ یہ بیان کیا کہ یہ جانور تمہارے بوجھل سامان دور دراز شہروں تک پہونچا دیتے ہیں جہاں تمہاری اور تمہارے سامان کی پہنچ جان جوکھوں میں ڈالے بغیر ممکن نہ تھی۔

اونٹ اور بیل خاص طور سے انسان کی خدمت بڑے پیمانہ پر انجام دیتے ہیں۔ آج ریل گاڑیوں، ٹرکوں ہوائی جہازوں کے زمانے میں بھی انسان ان جانوروں سے مستغنی نہیں۔ کتنے مقامات دنیا میں ایسے ہیں جہاں یہ تمام نو ایجاد سواریاں بار برداری کا کام نہیں دے سکتیں وہاں بھی انہیں کی خدمات حاصل کرنے پر انسان مجبور ہوتا ہے

انعام یعنی اونٹ اور بیل وغیرہ کی باربرداری کا ذکر آیا تو اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ذکر بھی مناسب ہوا جن کی تخلیق ہی سواری اور بار برداری کیلئے ہے ان کے دودھ یا گوشت سے ..... انسان کا فائدہ متعلق نہیں کیونکہ از روئے شریعت وہ اخلاقی بیماریوں کا سبب ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں۔ فرمایا والخیل والبغال والحمیر یعنی ہم نے گھوڑے۔ خچر۔ گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو۔ اس میں بار برداری بھی ضمناً آگئی۔ اور ان کو اس لئے بھی پیدا کیا کہ یہ تمہارے لئے زینت بنیں۔ زینت سے وہی شان وشوکت مراد ہے جو عرفاً ان جانوروں کے مالکان کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے

قرآن میں ریل، موٹر، ہوائی جہاز کا ذکر

آخر میں سواری کے تین جانور گھوڑے، خچر، گدھے کا خاص طور سے بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی سواریوں کے متعلق بصیغہ استقبال فرمایا ویخلق ما لا تعلمون یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا وہ چیزیں جن کو تم نہیں جانتے۔ اس میں وہ تمام انواع واقسام کے جانور بھی داخل ہیں جو جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں میں۔ پھلوں پھولوں میں اور حیوانات کے اجسام میں حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں جن کا احاطہ کوئی انسان نہیں کر سکتا (کما ذکرہ فی البحر) اور اس میں وہ تمام نو ایجاد سواری گاڑیاں بھی داخل ہیں جن کا زمانہ قدیم میں نہ وجود تھا نہ کوئی تصور۔ مثلاً ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ جو اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ تمام چیزیں بھی اس میں داخل ہیں جو آئندہ زمانہ میں ایجاد ہوں گی کیونکہ تخلیق ان سب چیزوں کی درحقیقت خالق مطلق ہی کا کام ہے

ئنس قدیم و جدید کا اس میں صرف اتنا ہی کام ہے کہ قدرت
پیدا کی ہوئی دھاتوں میں قدرت ہی کی دی ہوئی عقل و
کے ذریعہ جوڑ توڑ کر کے ان کے مختلف کل پرزے بنالے
پھر اس میں قدرت الٰہیہ کی بخشی ہوئی ہوا۔ پانی۔ آگ وغیرہ
سے برقی رو پیدا کرے یا قدرت ہی کے دیئے ہوئے خزانوں
سے پیٹرول نکالکر ان سواریوں میں استعمال کرے۔ سائنس قدیم
جدید مل کر بھی نہ کوئی لوہا پیتل پیدا کر سکتی ہے نہ ایلومونیم قسم
ہلکی دھاتیں بنا سکتی ہے نہ لکڑی پیدا کر سکتی ہے نہ ہوا اور
ی پیدا کرنا اس کے بس میں ہے۔ ان کا کام اس سے زائد نہیں
قدرت الٰہیہ کی پیدا کی ہوئی قوتوں کا استعمال سیکھ لے دنیا
کی ساری ایجادات صرف اسی استعمال کی تفصیل ہیں۔ اس لئے
ب ذرا بھی کوئی غور و فکر سے کام لے اسکے لئے یہاں سب نئی ایجادات
و تخلیق خالق مطلق کہنے اور تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل نظر ہے کہ پچھلی تمام
اشیاء کی تخلیق میں لفظ ماضی خلق استعمال فرمایا گیا ہے
ور معروف سواریوں کا ذکر کرنے کے بعد بصیغہ مستقبل یخلق ارشاد
ہوا ہے اس میں تغیر عنوان سے واضح ہو گیا کہ یہ لفظ ان سواریوں
اور دوسری اشیاء کے متعلق ہے جو ابھی معرض وجود میں نہیں
آئی اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اگلے زمانے میں کیا کیا سواریاں
اور دوسری اشیاء پیدا کرنا ہے ان کا اظہار اس مختصر جملے
میں فرما دیا۔

حق جل شانہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ آئندہ وجود میں آنیوالی
تمام نئی ایجادات کا نام لیکر ذکر فرما دیتے، مگر اس زمانے میں اگر
ریل، موٹر، طیارہ وغیرہ کے الفاظ ذکر بھی کر دیئے جاتے تو
اس میں بجز تشویش ذہن کے کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ ان اشیاء
کا اس وقت تصور کرنا بھی لوگوں کے لئے آسان نہ تھا۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ نے فرمایا
کہ ہمارے استاذ الاساتذہ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ
نانوتوی ؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ریل کا ذکر موجود ہے
اور اسی آیت سے استدلال فرمایا۔ اس وقت تک موٹریں عام نہ ہوئی
تھیں اور ہوائی جہاز ایجاد نہ ہوئے تھے۔ اس لئے ریل کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

احکام و مسائل

مسئلہ:۔ قرآن کریم نے اول انعام یعنی اونٹ گائے، بکری کا ذکر فرمایا اور ان کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ ان کا گوشت کھانا بھی قرار دیا۔ پھر اس سے الگ کر کے فرمایا والخیل والبغال والحمیر ان کے فوائد میں سواری لینے اور ان سے اپنی زینت حاصل کرنے کا تو ذکر کیا مگر گوشت کھانے کا یہاں ذکر نہیں کیا اس میں یہ دلالت پائی جاتی ہے کہ گھوڑے، خچر، گدھے کا گوشت حلال نہیں، خچر اور گدھے کا گوشت حرام ہونے پر تو جمہور فقہاء کا اتفاق ہے اور ایک مستقل حدیث میں انکی حرمت کا صراحۃً بھی ذکر آیا ہے۔ مگر گھوڑے کے معاملہ میں حدیث کی دو روایتیں متعارض آئی ہیں ایک سے حلال اور دوسری سے حرام ہونا معلوم ہوتا ہے اس لئے فقہاء امت کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہو گئے بعض نے حلال قرار دیا بعض نے حرام، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے اسی تعارض ادلہ کی وجہ سے گھوڑے کے گوشت کو گدھے اور خچر کی طرح حرام تو نہیں مگر مکروہ قرار دیا۔

(احکام القرآن)

مسئلہ۔ اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تفاخر و تکبر حرام ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت کا حاصل اپنے دل کی خوشی یا اللہ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہے، نہ دل میں اپنے کو اس نعمت کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے بلکہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور تکبر و تفاخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا مستحق اور دوسروں کو حقیر سمجھا جاتا ہے وہ حرام ہے۔

(بیان القرآن)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

فرانسیسی کا ترجمہ: جناب محمد حسن عسکری

حضرت ابوبکرؓ کی سفارت بنام ہرقل

اسلامی دنیا اور شہنشاہ ہرقل کے درمیان جو دینی اور سیاسی نوعیت کا نامہ و پیام ہوا ہے[1] اس کے ضمن میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کے متعلق تفصیلات تو کثرت سے موجود ہیں، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے تحقیقی کام کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ بات اس لئے اور بھی حیرت انگیز ہو جاتی ہے کہ یہ حکایت ہیئت کے چند اختلافات کے ساتھ عربی ماٰخذ میں بھی ملتی ہے اور بازنطینی ماٰخذ میں بھی دونوں جگہ یہ قصہ اپنے اپنے انداز سے بیان کیا گیا ہے، بہرحال تحقیق و تدقیق کی کوشش سے پہلے دونوں طرف کے بیانات سن لیجیے۔

بازنطینی بیانات

لوئی برے ای اے (Louis Brehier) نے اپنی فرانسیسی تصنیف "بازنطینی تہذیب" (پیرس ۱۹۵۰ء ص ۲-۲۹۱) میں مندرجہ ذیل حقائق نمایاں طور سے پیش کئے ہیں:-

"پیشین گوئیوں کی کتابیں ــــــ شاہی کتب خانہ میں ایک کتاب تھی جس میں بازنطینی سلطنت کے مستقبل کا پورا حال بیان کیا گیا تھا، اور ساتھ ہی شہنشاہوں کی تصویریں بھی تھیں، اس قسم کی تحریروں کی موجودگی کی تصدیق بعض غیر ملکیوں نے بھی کی ہے جنھیں یہ چیز دکھائی گئی تھی۔ (دیکھئے شہنشاہ لے اوں ششم کی "تقاریر و تصانیف") نووگورود (Novgorod) کے اسقفِ اعظم آن توان (Antoine) کے بیان کے مطابق لے اوں (Le'on) المقلب بہ عالم نے اسی قسم کی ایک کتاب نقل کی تھی جو اسے حضرت دانیالؑ کے مقبرے میں ایک بلین پر لپٹی ہوئی ملی تھی۔ (دیکھئے آن توان کی تصنیف "زائر نامہ")"۔

---

[1] اس سلسلے میں میرے یہ مضامین بھی دیکھئے:- "عیسائیت سے اسلام کے دوستانہ تعلقات اور ان کے خراب ہونے کے اسباب" (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل، جنوری ۱۹۵۳ء، ص ۴۱-۵۵) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ہرقل کے نام" (رسالہ ارابیکا ۱۹۵۵ء، ص ۹۷-۱۱۰) میری فرانسیسی کتاب "پیغمبرِ اسلام" ۱۹۵۹ء کا باب "بازنطینی"۔

اب مناسب ہوگا کہ برے آئی اے نے جن لاطینی عبارتوں کا حوالہ دیا ہے ان کا لفظ بلفظ ترجمہ پیش کردیا جائے۔

(۱) مِین کی شائع کردہ کتاب "پاترو لوگیا گریکا" (یونانی پادریوں کی تالیفات) جلد ۱۰۷، عمود ۱۱۲۱ تا ۱۱۴۴، رسالہ شہنشاہ لیون (عربی میں الیون) الملقب بہ عالِم کی پیشین گوئیاں باتصویر، نیز اس کی یونانی زبان میں شرح۔

قاری پطرس لامبے قیوس سے خطاب — رومی (بیزنطینی) تاریخ کی جامع تالیف سے کوئی چیز چھوٹ نہ جانے کے خیال سے .... مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس میں ان پیشین گوئیوں کو بھی شامل کردوں جو شہنشاہ لیون الملقب بہ عالم کی طرف منسوب ہیں۔ نیز ان پیشین گو تصویروں کو جن کے متعلق عام خیال پایا جاتا ہے کہ وہ سلطنت قسطنطنیہ کی آئندہ پیش آنے والی مصیبتوں کی پیشین گوئی کرتی ہیں ..... اس مجلّہ میں مجھے ایک گمنام مؤلف کا رسالہ ملا ہے جو یونانی زبان میں شہنشاہ لیون کی پیشین گوئیوں کی شرح پر مشتمل ہے موضوع کی مماثلت کے باعث مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو یک جا شائع کردوں۔ بلکہ مزید آگے بڑھ کر میں یہ پوچھوں گا کہ آیا لیون کی یہ پیشین گوئیاں وہی تو نہیں ہیں جو تیوفیل کی طرف منسوب ہیں اور جن کا مخطوطہ کہتے ہیں کہ کتب خانۂ واتیکانا (پوپ کے قصر) میں محفوظ ہے؟

پرانے مؤلفوں کی شہادتیں

مورخ زوناراس کا بیان ہے کہ — جہاں تک شہنشاہ لیون الملقب بہ ارمنی کی موت کا تعلق ہے، یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شاہی کتب خانے میں ایک کتاب تھی جس میں (بیزنطینی) شہنشاہوں کے متعلق پیشین گوئیاں پائی جاتی تھیں اور اس میں آدمیوں اور جانوروں کی تصویریں بھی بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ ایسی ہی ایک تصویر میں ایک شیر کی شکل تھی جس کی پشت پر علامت (×) بنائی گئی تھی۔ شیر کے پیچھے ایک شخص کھڑا تھا جو شیر کو عین وسط میں (دار پار نیزے سے؟) چبھو رہا تھا

اس کتاب میں جو پیشین گوئیاں تھیں ان کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سبیل (قدیم یونانی کاہنہ) کی کی ہوئی تھیں کہتے ہیں کہ اس زمانے کے ایک مالی مقدمات کو سننے والے افسرِ عدالت نے اس معمّے کی کلید مہیا کی تھی اور کہا تھا کہ مراد یہ ہے کہ شہنشاہ لیون حضرت عیسیٰ مسیح کی عیدِ ولادت کے دن قتل کردیا جائے گا (بادشاہ لیون کے نام کے لغوی معنی ہیں شیر کے اور لفظ مسیح کو یونانی حروف میں لکھیں تو پہلا حرف "×" ہوتا ہے) شیر کے بیچ میں علامت "×" کے پاس وار پار چبھونے کے معنی ہیں لیون عیدِ میلادِ مسیح کے دن قتل کردیا جائے گا۔

مولف قیدرانوس کی کتاب صفحہ ۴۹۳ اشاعت شاہی میں لکھا ہے — سبیل کی یہ پیشین گوئی شہنشاہ کے کتب خانہ کی ایک کتاب میں درج تھی، اس کتاب میں پیشین گوئیوں کے علاوہ شہنشاہوں کی تصویریں بھی تھیں اس کتاب میں ایک شیر کی تصویر بنائی گئی تھی وغیرہ۔

نقفورس گرگوراس کی کتاب شائع کردہ (Colon. Allobrog. 5) صفحہ ۱۰۲ میں لکھا ہے — شہنشاہ کو اصل میں ایک پرانی کتاب ملی تھی اس میں عبارتیں بھی تھیں اور چیستاں تصویریں بھی، اور اس میں پیشین گوئی کے طور پر یہ بتا دیا گیا تھا کہ شہنشاہوں کی جانشینی کس طور پر عمل میں آئے گی۔

مورخ پادری لیوت پرانَد کا بیان رفا بریقس کے سلسلے میں عہدِ عتیق یعنی توریت کی جعلی کتاب ۱/۱۱۳۶ میں — شہنشاہ نقفور فوقاس نے اشوریا یعنی عراق والوں پر کس لئے حملہ کیا تھا اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے یونانیوں اور عربوں دونوں کے پاس ایسی کتابیں پائی جاتی ہیں جو حضرت دانیال علیہ السلام کے رؤیا پر مشتمل ہیں، اور میرے پاس سبیل (کاہنہ) کی کتابیں ہیں، ان میں صراحت بیان ہوا ہے کہ کون سا شہنشاہ کتنی مدت حکمران رہے گا،

اور اس کے زمانے میں کیا حوادث وقوع میں آئیں گے، مثلاً امن یا فتنہ، عربوں کو پیش آنے خوش بختانہ واقعات یا بدبختانہ چنانچہ اس میں لکھا تھا کہ اس شہنشاہ نقفور فوقاس کے زمانے میں یعنی ۹۶۳ء تا ۹۶۹ء یونانیوں کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ اشوریوں کو شکست دے سکیں اور یہ کہ یہ شہنشاہ سات برس حکمراں رہے گا۔

(۲) دوسرا حوالہ یعنی اسقف اعظم آں توان کی بیان کردہ حکایت مندرجۂ ذیل ہے۔ اسقف اعظم کی کتاب قدیم روسی زبان میں ہے، اور ۱۸۷۲ء میں SAVVAIT OV نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ اس عبارت کے ترجمے میں میرے دوست جناب ارسلاں بوہدانووکر نے میری مدد فرمائی ہے "...... مقدس صوفیا کے کلیسا کے دروازے کی طرف جو دیوار ہے یعنی ایک اندرونی دروازے کی طرف اس پر شہنشاہ لیون الملقب بہ عالم کی تصویر بنی ہوئی ہے، اس کے چہرہ پر ایک قیمتی پتھر لگا ہوا ہے جو مقدس صوفیا (کے کلیسا) کی تاریکی کو منور کر دیتا ہے[1]۔ اس شہنشاہ لیون کو مقدس نبی حضرت دانیال ؑ کے مزار میں ایک نقشہ دستیاب ہوا تھا اس نے آئندہ کا حال بتانے والی اس عبارت کو نقل کر لیا تھا جس میں واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ جب تک یہ شہر قائم رہے گا قسطنطنیہ میں کون کون حکمرانی کرے گا" (ص ۲۶-۹۶)

جناب بوہدانووکر نے از راہ عنایت مندرجۂ ذیل ترجمہ بھی فراہم کیا ہے ——— "بہشتی دروازے کے ایک جانب ایک بہت بڑی تصویر ہے جس میں شہنشاہ لیون الملقب بہ عالم کی شبیہ پیش کی گئی ہے۔ اس کے چہرے میں ایک قیمتی پتھر لگا ہوا ہے جو مقدس صوفیا (کے کلیسا) میں ادھر ادھر تمک رات کی تاریکی کو آگ کی طرح، چاند کی طرح، منور کر دیتا ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ یہ بادشاہ ولی تو ہے نہیں، پھر اس کی تصویر یہاں کیوں ہے اور اس کی تعظیم کیوں کی جاتی ہے؟ کلیسا کے لوگوں نے جواب دیا کہ اس شہنشاہ لیون کو بابل میں مقدس نبی حضرت دانیال ؑ کے مزار میں ایک نقشہ دستیاب ہوا تھا جسے نقل کر کے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ اس کے انتقال کے کئی سال بعد کوئی اس تحریر کو قسطنطنیہ لے آیا، اور اس پیشین گوئی کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس میں یونانی شہنشاہوں کے نام لکھے ہوئے تھے، اور یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ جب تک یہ شہر باقی ہے قسطنطنیہ میں کون کون حکمرانی کرے گا"[2]۔

اس حکایت کو قبول کرنے میں ذرا سا تامل اس لئے ہوتا ہے کہ اگر یہ پیشینگوئیاں حضرت دانیال علیہ السلام کی ہیں تو ان میں صرف و محض بازنطینی شہنشاہوں کا ہی ذکر کیوں ہے؟ مگر یہ ممکن بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصل تحریر اس سے کہیں زیادہ جامع ہو، اور بازنطینی سلطنت سے متعلق جو چیزیں تھیں انہیں نقل کر کے ایک خاص کتاب اس سلطنت کے حکمرانوں اور خصوصاً شہنشاہ لیون کے استعمال کے لئے مرتب کر لی گئی ہو۔

عربوں کے بیانات

زوناراس، آں توان اور جن مغربی ماخذ کے حوالے اوپر پیش کئے گئے ان کے زمانے سے

---

[1] سعد الدین کی "تاج التواریخ" میں ترکوں کی فتح استانبول کے وقت ایا صوفیہ کی حالت کا طویل اور دلچسپ بیان موجود ہے۔ گارسین دتاسی نے اپنی فرانسیسی کتاب "حکایتیں، قصے اور عوامی گیت" (۱۸۷۶ء) میں جو اقتباسات دیئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔

[2] روسی زبان میں مضامین کے ایک مجموعے سے اقتباس جو ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ PRAVOSLAVNYI PALESTINSKI SBORNIC شمارہ ۱۵ صفحہ ۵۳-۵۴۔

بہت پہلے عرب مصنفوں نے بازنطینی دربار کی اس متذکرہ بالا کتاب کا حال بیان کیا ہے، بلکہ خود ہرقل کے دور ہی میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ ان کی حکایتوں کو سرسری طور سے پڑھا جائے تو فوراً ہی دل چاہتا ہے کہ انھیں موضوع نہ سہی تو محض قصہ کہانی سمجھ کر رد کردیا جائے۔ یہاں تک کہ خود میں نے ہی ۱۹۳۵ء میں تفصیلات پر بحث کئے بغیر یہ لکھ دیا تھا ——— "حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے تو صوبوں کی بغاوت دبانے میں مشغول رہے۔

الذہبی (تاریخ الاسلام" مخطوطہ، قومی کتب خانہ پیرس) کے قول کے مطابق، اس کام سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے شہنشاہ ہرقل کے پاس ایک سفارت بھیجی، اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس ضمن میں ذہبی کا طویل بیان قصہ کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔" (میری فرانسیسی کتاب "اسلامی سیاسی دستاویزات" جلد اول صفحہ ۵۱)

اس وقت میرا واحد ماٰخذ الذہبیؒ (متوفی ۱۳۴۷ء) کی کتاب تھی جو اب قاہرہ سے شائع ہوچکی ہے، اس کتاب کے علاوہ یہ حکایت مندرجۂ ذیل تصنیفات میں بھی ملتی ہے:۔

(۱) الاخبار الطوال از دینوریؒ (متوفی ۸۹۵ء) صفحہ ۲۱-۲۲۔

(۲) دلائل النبوۃ از ابو نعیمؒ (متوفی ۱۰۳۸ء) صفحہ ۹-۱۱- اور یہاں سے ابن العربیؒ (متوفی ۱۲۴۰ء) کی "محاضرات الابرار" جلد اول صفحہ ۵۵ تا ۵۸ میں نقل ہوئی ہے

(۳) دلائل النبوۃ از بیہقی (متوفی ۱۰۶۶ء) جلد اول مخطوطہ، استانبول اور یہاں سے ابن کثیرؒ کی تفسیر جلد دوم صفحہ ۲۵۱ تا ۲۵۳ میں سورت ۹ آیت ۱۵۴ کے ضمن میں نقل ہوئی ہے، ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ جہاں تک راویوں کے سلسلے کا تعلق ہے، اس روایت میں کوئی سقم نہیں۔

جہاں تک ذہبیؒ کا تعلق ہے، انھوں نے یہ روایت ابن مندہ، الحاکم، علی ابن حرب اور الزبیر ابن بکار کی سند کے ساتھ پیش کی ہے۔ یہ سب روایتیں آپس میں متفق ہیں بعض تو حضرت عبادہ ابن الصامتؓ تک جاتی ہیں، اور بعض حضرت ہشام ابن العاصؓ تک (یہ دونوں حضرات سفارت کے تین ارکان میں سے تھے۔ اور تیسرے نعیم ابن عبداللہؓ تھے)[1]

سفارت بھیجنے کی وجوہات

ایک مسلمان ایلچی کے شہید کردئے جانے کی وجہ سے اسلام اور بازنطینی سلطنت کی جنگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی شروع ہوگئی تھی (یعنی موتہ اور تبوک کی مہمات)۔ اپنے وصال سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ فوج کا ایک دستہ حضرت اسامہؓ کی زیر قیادت بھیجا جائے (۶۳۲ء) حضورؐ کے وصال کو ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۶۳۲ء یا ۶۳۴ء) نے یہ دستہ فلسطین کی طرف روانہ کردیا۔

۶۳۳ء میں بھرپور جنگ شروع ہوگئی جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی جاری رہی ہماری حکایت کے ماٰخذ میں سے دینوری نے اس واقعے کی باقاعدہ تاریخ دی ہے ——— "عبداللہ (یہاں

---

[1] حضرت زبیر ابن بکار کے سلسلے میں ایک بات عرض کرنی ہے ان کی کتاب "نسب قریش" اب بھی موجود ہے، مگر پوری نہیں۔ صرف ایک حصہ ہیں نے آکسفورڈ والا جزء دیکھا ہے اور استانبول والا جزء بھی مگر یہ وہ اجزاء نہیں جن میں ہماری حکایت مل سکے۔

بادہ" پڑھیے) ابن الصامت کی سند سے روایت ہے کہ
نھوں نے کہا جس سال ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اسی سال
نھوں نے مجھے بازنطینیوں کے شہنشاہ کے پاس بھیجا"
س حکایت میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کی بنا پر ہم
بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسے زمانہ کا واقعہ
ہے جب مسلمان بازنطینیوں کو چند بار شکست دے چکے تھے
ور ان کی زیر سرپرستی رہنے والے غسانیوں کے چند علاقوں
پر قبضہ کر چکے تھے یعنی یہ واقعہ غالباً ۶۳۳ء کے آخر کا ہے

سفارت کا حال

فی الحال جو ماخذ موجود ہیں ان میں ہمارا سب سے
بڑا ماخذ دینوری کی کتاب ہے، مگر انھوں نے اپنے ماخذ
اور راویوں کے سلسلے کا ذکر نہیں کیا۔ ویسے بھی انھوں نے
صرف ایک خلاصہ پیش کر دیا ہے، ابونعیم کی کتاب دوبار
چھپ چکی ہے۔ اس لئے میں بیہقیؒ کے بیان کو ترجیح دیتا
ہوں اور استانبول کے مخطوطے کے مطابق ان کی عبارت
کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:۔

"ہم الحکیم سے روایت کرتے ہیں، وہ محمد بن عبداللہ
بن اسحاق البغوی سے، وہ ابراہیم بن الہیثم البلدی
سے، وہ عبدالعزیز بن مسلم بن ادریس سے، وہ عبداللہ
بن ادریس سے، وہ شرجبیل بن مسلم سے، وہ ابوامامہ
الباہلی سے، وہ ہشام رضؓ ابن العاص الاموی سے جو کہتے
ہیں کہ مجھے ایک اور شخص کے ساتھ بازنطینیوں
کے آقا ہرقل کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ اسے اسلام لانے
کی دعوت دوں (ابونعیم کے بیان کے مطابق "ہشامؓ
ابن العاص، نعیم ابن عبداللہ اور ایک تیسرے شخص کو
بھیجا گیا تھا" ذہبی کی کتاب میں زبیر ابن بکار اور علی

ابن حرب کہتے ہیں ــــ "عبادہؓ ابن الصامت بیان
کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند
صحابیوں کے ساتھ ہرقل کے پاس بھیجا")، ہم روانہ ہوئے
اور الغوطہ، یعنی دمشق کے غوطہ میں جبلہ ابن الایہم الغسانی
کے دربار میں پہنچے، ہم اس کے پاس اس وقت گئے جب
وہ تخت پر بیٹھ چکا تھا، اس نے ہمارے پاس ایک آدمی
بھیجا تاکہ ہم اسی سے بات چیت کر لیں۔ ہم نے کہا ـــ "خدا
کی قسم، ہم کسی درمیانی آدمی سے گفتگو نہیں کریں گے
ہمیں تو بادشاہ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ اگر بادشاہ ہمیں
اجازت دے تو ہم بس اسی سے بات کریں گے۔ ورنہ کسی
درمیانی آدمی سے تو ہم مطلق بات نہیں کریں گے۔" ایلچی
نے واپس جا کر یہ بات دہرا دی۔ اس پر جبلہ نے ہمیں اجازت
دیدی اور کہا ـــ "اچھا بولو کیا کہتے ہو" ہشامؓ بن
العاص نے بولنا شروع کیا اور اسے اسلام لانے کی دعوت
دی (ابونعیم کہتے ہیں ـــ "لیکن اس نے کوئی اچھا
جواب نہیں دیا۔") وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا۔
ہشام نے اس سے پوچھا ـــ "ان سیاہ کپڑوں کا کیا
مطلب ہے؟" (ابونعیم ـــ "ٹاٹ کے کپڑے") اس نے
جواب دیا۔ "میں نے یہ کپڑے پہنتے ہوئے قسم کھائی ہے
کہ جب تک تم لوگوں کو شام سے باہر نہ نکال دوں یہ کپڑے
نہیں اتاروں گا۔" ہم نے کہا ـــ "خدا کی قسم جو علاقہ
تیرے قبضہ میں ہے، ہم تو اسے بھی چھین لیں گے، بلکہ (بازنطینی)
شہنشاہ کی سلطنت کو بھی۔ ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ
وسلم نے ہمیں پہلے سے اس بات کی خبر دیدی ہے۔" اس نے
کہا ـــ "یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ یہ کام تو وہی لوگ
کر سکیں گے جو دن بھر روزہ رکھیں اور رات بھر نماز میں
کھڑے رہیں" (ابونعیم ـــ "ہم نے کہا، خدا کی قسم ہمیں

لہ غسانی علاقے میں ابتدائی جنگوں کے سلسلے میں دیکھئے ہِٹی کی "تاریخ عرب" ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۴۷ تا ۱۴۸

لوگ تو ہم ہی ہیں۔ ہم دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات نماز میں کھڑے کھڑے گزارتے ہیں") پھر اس نے پوچھا کہ تمہارا روزہ (اور تمہاری نماز) کیسا ہوتا ہے؟ ہم نے اسے روزہ کا حال سنایا۔ یہ سن کر اس کا رنگ فق ہو گیا پھر اس نے ہم سے کہا ــــ "اچھا جاؤ"۔ اور اس نے ہمارے ساتھ ایک ایلچی بھیجدیا کہ ہمیں شہنشاہ کے پاس لیجائے ہم روانہ ہو گئے۔ اور جب ہم شہر (ابو نعیم ــــ "قسطنطینیہ") کے قریب پہنچے تو ہمارے ساتھ جو ایلچی تھا وہ کہنے لگا ــــ

"تمہارے ان جانوروں (اونٹوں) کو سلطانی شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، اگر تم چاہو تو ہم تمہیں گھوڑے اور خچر فراہم کر دیں"۔ ہم نے جواب دیا ــــ "خدا کی قسم ہم تو انھیں جانوروں پر سوار ہو کے داخل ہوں گے"۔ ہمارے اس انکار کا معاملہ شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس نے کہا ــــ "ان کی خاص سواری یہی ہے تو انھیں اسپر اندر آنے دو"۔ ہم اپنے پٹکوں میں تلواریں لٹکائے شہر میں داخل ہوئے۔ (ابو نعیم ــــ "قسطنطینیہ کے باشندے اپنے گھروں میں سے ہمیں دیکھ رہے تھے، اور حیران ہو رہے تھے")

ہم آگے بڑھتے ہوئے اس بالاخانہ تک جا پہنچے جہاں سے وہ ہمیں دیکھ رہا تھا، ہم نے اپنے اونٹ بٹھلائے اور کلمہ پڑھا ــــ لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر خدا شاہد ہے کہ بالاخانہ اس طرح ہلنے لگا جیسے تیز ہوا کے جھونکے سے کھجوروں کا گچھا ہلتا ہے۔ راوی آگے بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے ایک ایلچی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہا ــــ "تمہیں ہمارے سامنے اپنے دین کا اظہار نہیں کرنا چاہئے"۔ اس نے ہمیں اپنے پاس اندر آنے کی اجازت دیدی۔ ہم داخل ہوئے۔ ہم اس کے قریب گئے تو دیکھا کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کے چاروں طرف بازنطینی امرا

ہیں۔ کمرے کی ساری چیزیں سرخ (اودے) رنگ کی تھیں۔ اُس کے گرد کی چیزیں بھی اور خود اس کا لباس بھی اُودا تھا، (ابو نعیم ــــ "ہم داخل ہوئے، مگر ہم نے سلام نہیں کیا") اس نے تبسم کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور کہا ــــ "جس وقت تم میرے پاس آئے تو اپنے دین کے مطابق مجھے سلام کرنے سے تمہیں کس چیز نے روکا" شہنشاہ کے قریب ایک ترجمان کھڑا تھا جو عربی خوب بولتا تھا اور باتیں بھی بہت کرتا تھا۔

ہم ــــ بات یہ ہے کہ ہمارا سلام کا طریقہ تیرے لئے جائز نہیں، اور تیرے یہاں جو سلام کا دستور ہے ہمارے لئے جائز نہیں۔

وہ ــــ تم لوگ آپس میں کس طرح سلام کرتے ہو

ہم ــــ السلام علیک۔

وہ ــــ اور اپنے بادشاہ کو تم کس طرح سلام کرتے ہو

ہم ــــ بالکل اسی طرح

وہ ــــ اور وہ تمہیں کس طرح جواب دیتا ہے

ہم ــــ بالکل اسی طرح۔

وہ ــــ (ابو نعیم کے بیان کے مطابق ــــ تمہارے یہاں مرنے والے کا وارث کون ہوتا ہے؟ ــــ "سب سے قریب کے رشتے دار" ــــ "کیا تمہارے رسول تمہاری میراثوں میں سے کچھ لیا کرتے تھے؟" ــــ "اگر کوئی شخص اپنے پیچھے وارث اور قریبی رشتہ دار چھوڑ کر مرتا تھا تو میراث انھیں کو ملتی تھی، ہمارے رسول ہماری میراث میں سے کچھ نہیں لیتے تھے" ــــ "کیا تمہارے بادشاہوں کا بھی یہی

حال ہے ؟ — "ہاں" —) تم لوگوں کا سب سے اہم کلمہ کیا ہے ؟

ہم — لا الٰہ الا اللہ اللہ اکبر۔ جب ہم نے کلمہ پڑھا تو خدا گواہ ہے کہ پوری منزل (ابو نعیم — "چھت[1]") ہلنے لگی یہاں تک کہ شہنشاہ سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگا۔

وہ — تم نے یہ جو کلمہ پڑھا جس سے پوری منزل ہلنے لگی، جب تم اپنے یہاں بھی یہ کلمہ پڑھتے ہو تو کیا ہمیشہ یہی اثر ہوتا ہے ؟

ہم — نہیں - ہم نے یہ بات پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ بس یہیں تیرے پاس دیکھی ہے۔

وہ — میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ جب بھی تم یہ کلمہ زبان سے نکالو اوپر جتنی چیزیں ہوں سب تمہارے سر پر آ پڑیں۔ اس کے لئے تو میں اپنی آدھی سلطنت خوشی سے دینے کو تیار ہوں۔

ہم — یہ کیوں ؟

وہ — کیونکہ پھر معاملہ آسان ہو جائے گا اور یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ یہ نبوت کا قصہ نہیں بلکہ انسانوں کی چالبازی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہم سے چند سوال پوچھے جن کا ہم نے جواب دیدیا پھر اس نے کہا کہ مجھے نماز اور روزے کا حال سناؤ ہم نے یہ بھی سنا دیا (اچھا چلو)

اس کے حکم سے ہماری بڑی خاطر مدارات ہوئی اور نہایت عمدہ مکان میں ٹھیرایا گیا۔ ہم نے تین راتیں گزاریں اس کے بعد اس نے رات کے وقت ہمیں بلایا۔ ہم اس کے پاس پہنچے۔ (ابو نعیم — "وہ اکیلا بیٹھا تھا، اور اس کے پاس کوئی بھی نہ تھا") اس نے ہم سے کہا کہ جو باتیں تم بیان کر چکے ہو انھیں پھر دہراؤ۔ ہم نے یہی کیا۔

اس کے بعد اس نے بڑے صندوق کی طرح کی ایک چیز منگوائی جس پر سونے کا ملمع تھا، اور جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے گھر مع دروازوں کے بنے ہوئے تھے (یعنی درازیں) اس نے ایک دروازے کا تالا کھولا اور سیاہ ریشم کا ایک ٹکڑا نکال کر اسے پھیلایا۔ اس پر کسی آدمی کی سرخ تصویر تھی جس کی آنکھیں بڑی بڑی، پشت قوی اور گردن اتنی لمبی تھی کہ میں نے ایسی کبھی نہیں دیکھی۔ اس آدمی کے داڑھی نہیں تھی، لیکن بال دو لٹوں کی شکل میں گندھے ہوئے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے جتنے انسان پیدا کئے ہیں ان میں یہ جمیل ترین تھا۔ پھر اس نے ہم سے پوچھا — "تم انھیں پہچانتے ہو ؟" ہم نے کہا — "نہیں"۔ وہ بولا — "یہ آدم ہیں" علیہ السلام۔ ان کے بال بہت گھنے تھے۔

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا، اور اس میں سے سیاہ ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر سفید رنگ کی تصویر تھی اس میں بال گھنگریالے تھے، آنکھیں سرخ، سر بڑا اور داڑھی بہت خوبصورت۔ پھر اس نے ہم سے پوچھا۔ "انھیں پہچانتے ہو ؟" ہم نے کہا — "نہیں"۔ اس نے بتایا — "یہ نوح ہیں" علیہ السلام۔

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا، اور اس میں سے سیاہ ریشم کا ٹکڑا نکالا، اس پر بھی کسی شخص کی تصویر تھی، بہت ہی سفید رنگ، خوبصورت آنکھیں، کشادہ پیشانی کتابی چہرہ، سفید داڑھی، معلوم ہوتا تھا گویا وہ آدمی مسکرا رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا — "انھیں پہچانتے ہو ؟" ہم نے کہا — "نہیں"۔ اس نے جواب دیا — "یہ ابراہیم ہیں" علیہ السلام۔

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور ایک سفید تصویر

---

[1] قسطنطنیہ کے شاہی محل اور دربار کے کمرے کا بیان بہے آئی اے کی فرانسیسی کتاب "بازنطینی سلطنت کے ادارے" میں صفحہ ۲۱۲ پر دیکھئے

نکالی خدا کی قسم یہ تو رسول اللہ .... تھے معلوم ہوتا تھا کہ آپ تبسّم فرما رہے ہیں۔ (ابو نعیم — "گویا ہم حضورؐ کو زندہ دیکھ رہے تھے۔") پھر اس نے ہم سے پوچھا — "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے کہا — "ہاں، یہ تو محمد رسول اللہؐ ہیں" — اور ہم رونے لگے۔ خدا شاہد ہے کہ وہ کچھ دیر تو کھڑا کا کھڑا رہ گیا پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور بولا — میں تمھیں خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا یہ وہی ہیں؟" ہم نے جواب دیا — "ہاں ہاں، وہی ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے تیری آنکھوں کے سامنے ہوں" تھوڑی دیر تو وہ خاموش رہا پھر کہنے لگا — "دراصل یہ تو سب سے آخری خانہ ہے۔ لیکن تمھارا امتحان لینے کے لئے میں نے اسے پہلے کھول لیا"

اس کے بعد اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سیاہ ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر سیاہی مائل بھورے رنگ کی تصویر بنی ہوئی تھی، اس شخص کے بال گھنگریالے اور گنجان تھے آنکھیں گہری، نظریں تیز، پیشانی پر بل، دانت بھینچے ہوئے اور ہونٹ بند۔ گویا غصّہ آرہا ہو۔ پھر اس نے پوچھا "انھیں جانتے ہو؟" ہم نے کہا — "نہیں" اس نے کہا — "یہ موسیٰ ہیں" علیہ السلام۔ موسیٰ علیہ السلام کے برابر ایک دوسری شبیہ تھی جو ان کی شکل سے ملتی جلتی تھی، لیکن سر پر تیل لگا ہوا، پیشانی چوڑی اور نمایاں، اور آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی پھیل کر تقریباً ناک تک پہنچی ہوئی۔ پھر اس نے پوچھا — "انھیں پہچانتے ہو؟" جب ہم نے کہا — "نہیں"، تو اس نے جواب دیا — "یہ ہارون بن عمران ہیں" علیہ السلام۔

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سفید ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر کسی شخص کی تصویر تھی۔ گندمی رنگ، سیدھے بال، درمیانہ قد، معلوم ہوتا تھا گویا غصّہ آرہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے جواب دیا "نہیں"۔ اس نے بتایا — "یہ لوط ہیں" علیہ السلام۔

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سفید ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر کسی شخص کی تصویر تھی۔ سرخی مائل سفید رنگ بلند ناک، پتلے پتلے رخسار، چہرہ حسین۔ اس نے پوچھا۔ "انھیں پہچانتے ہو؟" — ہم نے کہا — "نہیں"۔ اس نے بتایا۔ "یہ اسحاق ہیں" علیہ السلام۔

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور اس میں سے سفید ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر اسحاقؑ کی شکل سے مشابہ ایک تصویر بنی ہوئی تھی، لیکن نچلے ہونٹ پر ایک خال تھا۔ اس نے پوچھا۔ "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے جواب دیا "نہیں" اس نے بتایا — "یہ یعقوب ہیں"۔ علیہ السلام

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سیاہ ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر کسی شخص کی سفید تصویر بنی ہوئی تھی۔ حسین چہرہ بلند ناک، خوبصورت قد، چہرہ پر نور برستا ہوا، سرخی مائل رنگ، بشرے سے پرہیزگاری اور خدا طلبی نمایاں پھر اس نے پوچھا — "تم انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے جواب دیا "نہیں" اس نے بتایا — "یہ اسمٰعیلؑ ہیں، تمھارے رسول کے دادا۔

پھر اس نے ایک خانہ کھولا اور سفید ریشم کا ٹکڑا نکالا، جس پر ایسی شبیہ تھی جیسی حضرت آدمؑ کی تھی۔ اس شخص کا چہرہ سورج کی طرح تھا۔ پھر اس نے پوچھا — "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے جواب دیا — "نہیں"۔ اس نے بتایا — "یہ یوسف ہیں"۔ علیہ السلام

اس کے بعد اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سفید ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر کسی سرخ رنگ کے آدمی کی تصویر تھی، پتلی پتلی ٹانگیں، آنکھیں روشنی سے بچی ہوئی، پیٹ بڑھا ہوا، درمیانہ قد، پٹکے میں تلوار لٹکی ہوئی۔ اس نے پوچھا — "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے جواب دیا — "نہیں"۔ اس نے بتایا — "یہ داؤد ہیں" علیہ السلام

(ابونعیم کا بیان ـــــ سیاہ ریشم، چہرہ سُرخ یا سفید درمیانہ قد، مگر حلیہ مرد کے بجائے کسی نازک اندام عورت سے مشابہ)

پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سفید ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر کسی آدمی کی تصویر بنی تھی۔ پُشت نمایاں اور قوی، ٹانگیں لمبی، گھوڑے پر سوار۔ اس نے پوچھا ـــــ "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے کہا "نہیں" اس نے بتایا ـــــ "یہ سلیمان ہیں" علیہ السلام۔ (ابونعیم ـــــ "گھوڑے کی ٹانگیں لمبی لیکن کمر چھوٹی، دونوں طرف ایک ایک پر جو ہوا سے ہل رہا تھا"۔ دینوری ـــــ دو پروں والے گھوڑے پر سوار۔ اس نے کہا ـــــ یہ سلیمانؑ ہیں جنھیں ہوا اوپر اٹھائے ہوئے ہے")

آخر میں اس نے ایک اور خانہ کھولا اور سیاہ ریشم کا ٹکڑا نکالا جس پر ایک نوجوان کی سفید تصویر تھی۔ گھری سیاہ داڑھی گھنے بال، خوبصورت آنکھیں اور حسین چہرہ، اس نے پوچھا ـــــ "انھیں پہچانتے ہو؟" ہم نے کہا ـــــ "نہیں" اس نے بتایا۔ "یہ عیسیٰ ابن مریم ہیں" علیہ السلام۔

(ابونعیم ـــــ "پھر اس نے خانہ صندوق میں رکھدیا اور اُسے واپس بھجوا دیا")

اب ہم نے دریافت کیا۔ "تجھے یہ تصویریں کہاں سے ملیں؟ ہمارا خیال ہے کہ پیغمبروں کی یہ تصویریں سچی ہیں کیونکہ ہم نے جو اپنے رسولؐ کی تصویر دیکھی ہے وہ واقعی انھیںؐ کی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ آدمؑ نے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ ان کی اولاد میں جو پیغمبر ہوں گے وہ انھیں دکھائے جائیں۔ خدائے تعالیٰ نے پیغمبروں کی تصویریں انھیں بھجوادیں، جو سورج کے غروب ہونے کے مقام کے نزدیک آدمؑ کے خزانے میں محفوظ رہیں۔ ذوالقرنین (دینوری۔ "سکندر") نے انھیں سورج کے غروب ہونے کے مقام سے حاصل کیا اور دانیالؑ کو دے دیا"۔ (ذہبی ـــــ "اور دانیال نے انھیں ریشم کے ٹکڑوں پر نقل کرلیا۔ اور دانیالؑ نے جو نقل تیار کی تھی اس کی اصل یہ تصویریں تھیں"۔ لیکن ابونعیم کہتے ہیں ـــــ "اللہ تعالیٰ نے تصویروں کو بہشتی ریشم کے ٹکڑوں پر اتارا")۔ اور وہ کہنے لگا ـــــ "خدا کی قسم، میرا تو جی چاہتا ہے کہ میرا نفس مجھے سلطنت چھوڑنے کی اجازت دیدے، اور تم میں دل کے لحاظ سے جو کمترین درجے کا آدمی ہو میں اس کا غلام بن کے باقی زندگی گزاردوں"۔

اس کے بعد اس نے بڑی دریا دلی سے ہمیں تحائف دیئے اور ہمیں رخصت کر دیا۔ جب ہم حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور جو کچھ دیکھا تھا، شہنشاہ نے جو کچھ ہم سے کہا تھا اور جو تحائف دیئے تھے ان سب کا حال انھیں سنایا تو ابوبکرؓ رونے لگے اور فرمایا ـــــ ہائے بیچارا! اگر اللہ تعالیٰ کو اس کی فلاح منظور ہے تو وہ ایسا ہی کرے گا"۔ پھر فرمایا ـــــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خبر دے چکے ہیں کہ ان لوگوں (عیسائیوں) اور یہودیوں کے پاس محمدؐ کا پورا بیان موجود ہے"۔

چند گذارشات

ان حکایتوں میں بعض باتیں ناقابل یقین سی معلوم ہوتی ہیں۔ بہر حال چند چیزیں وثوق کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ نے ایک سفارت ضرور بھیجی تھی گو اس واقعے کا ذکر بازنطینی مورخوں کے یہاں نہیں ملتا۔

(۲) بازنطینی قصے اور عربوں کے بیان کردہ قصے میں اختلافات تو ضرور ہیں، لیکن چند باتیں نمایاں طور پر مماثل بھی ہیں۔ مثلاً دونوں طرف تصویروں کا بھی ذکر ہے اور پیشگوئیوں کا بھی، پھر دونوں قصوں کی بنیاد حضرت دانیالؑ پر ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں تضاد بھی نہیں ہے۔ شاہی خزانے میں تصویروں کے کئی مجموعے ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو ہرقل نے مسلمان سفیروں کو دکھایا، اور دوسرا لیون

الملقب بہ عالم کے استعمال میں رہتا تھا۔

(۳) قرآن شریف میں کئی ایسے پیغمبروں کا ذکر ہے جن کا نام بائبل میں نہیں آیا۔ مثلاً ہودؑ، صالحؑ۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ہماری حکایت میں صرف ان پیغمبروں کا ذکر ہے جن کے نام بائبل میں آتے ہیں اور جنھیں بازنطینی عیسائی بھی مانتے تھے۔

(۴) دانیال اور سکندر اعظم کو ہم عصر کہنے میں تاریخی غلطی ضرور ہوئی ہے، مگر ذوالقرنین کو سکندر اعظم سمجھنا لازمی نہیں۔ ہم روایت میں تھوڑی سی اصلاح بھی کر سکتے ہیں، حضرت دانیالؑ نے جو تصویریں نقل کی تھیں وہ کسی طرح سکندر کو مل گئی ہوں گی۔ اور یہ بات درست نہ ہوگی کہ دانیالؑ نے خود وہ تصویریں مقدونی فاتح کو دیں۔

(۵) ہمیں معلوم ہے کہ بائبل میں حضرت دانیالؑ کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہم مسلمانوں کے یہاں بھی اور یہودیوں کے یہاں بھی خوابوں اور پیشین گوئیوں سے متعلق ایسی تصنیفات کثرت سے موجود ہیں جن کی بنیاد حضرت دانیالؑ کی روایتوں پر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو حضرت دانیالؑ کے مزار میں خزانے موجود تھے[1]۔ کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ وہاں ایک صندوق ملا تھا جس میں ایک کتاب رکھی تھی۔ سونا چاندی اور بہت سی چیزیں بھی دستیاب ہوئی تھیں جن سے ہمیں یہاں مطلب نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت دانیالؑ کے بارے میں جو دوسرے بیانات کتابوں میں ملتے ہیں ان سے ہماری روایت بالکل مطابقت رکھتی ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ دوسری جگھوں پر بھی اس قسم کا تذکرہ ملتا ہے ___ مثلاً فلسطین کی ایک خانقاہ میں، چین کے شہنشاہ کے یہاں، اور وزی گوتھ دور کے ناولس میں۔

فلسطین میں

عظیم محدث بخاری روایت کرتے ہیں[2] کہ شروع میں جبیر ابن مطعم[3] اسلام نہیں لائے لیکن جب وہ بصرے گئے تو ایک عیسائی نے ان سے دریافت کیا کہ جس عرب نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کیا تم اسے ذاتی طور سے جانتے ہو؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ لوگ انھیں ایک خانقاہ میں لے گئے جہاں بہت سی تصویریں تھیں، پہلے کمرے میں تو انھیں "ان پیغمبرؐ کی تصویر نہیں ملی مگر دوسرے کمرے میں انھوں نے تصویر فوراً پہچان لی تصویر میں ایک تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے اور دوسرے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالے عنہ جنھوں نے حضورؐ کے قدم مبارک پکڑ رکھے تھے۔ ان کے رہنما نے ان سے کہا ___

"سارے انبیاء کے بعد میں دوسرے نبی آئے ہیں، مگر ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔ جس شخص نے ان کے قدم پکڑ رکھے ہیں یہ ان آخری نبیؐ کا جانشین ہے۔"

---

[1] دوسرے مآخذ کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل کتابیں دیکھیے ___ بلاذری "فتوح البلدان"، یاقوت "معجم البلدان"، طبری "تاریخ" جلد اول صفحہ ۷-۲۵۶۶- ابوعبید "اموال"، خطیب البغدادی "تقیید العلم" صفحہ ۵۱-۵۲- ابن عبد البر "جامع بیان العلم" جلد دوم صفحہ ۲۴- ابن الاثیر "اسد الغابہ" جلد اول صفحہ ۲۳ اور جلد سوم صفحہ ۱۲۶- بیہقی "دلائل النبوۃ"

[2] بخاری "تاریخ کبیر"، ذکر محمد بن عمر بن ابراہیم جو جبیر بن مطعم کی اولاد میں ہیں۔ ابونعیم "دلائل النبوۃ" صفحہ ۹- بیہقی "دلائل النبوۃ" (مخطوطہ استانبول) ذہبی "تاریخ" جلد اول صفحہ ۸-۲۹۷- ابن کثیر "تفسیر" جلد دوم صفحہ ۲۵۳ سورت ۷، آیت ۱۵۷ کے سلسلے میں۔

[3] ابن عبد البر کی کتاب "استیعاب" کے مطابق وہ ۶ھ یا ۸ھ میں اسلام لائے۔ بہرحال وہ حضرت ابوبکرؓ کے گہرے دوست بلکہ شاگرد سمجھے جاتے ہیں اس کی وجہ اس اہمیت سے ظاہر ہو جاتی ہے جو جبیرؓ کی حکایت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالے عنہ کو حاصل ہے۔

چین میں

پیرس کے قومی کتب خانے میں ایک مشہور عربی مخطوطہ[1] ہے۔ مصنف کا نام تو اس میں جود نہیں، لیکن اس مخطوطے کو یا کم سے کم اس کے ایک ے یعنی ضمیمے کو دسویں صدی کی کسی شخص ابوزید السیرافی نے ل کیا ہے، یہی ضمیمہ یہاں ہمارے کام کا ہے، اس میں ابن ہب الحباری نے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے چین کے شہنشاہ ے دربار میں انبیا کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس کے کچھ عرصے بد مسعودی[2] نے بھی یہی حکایت دہرائی ہے، غالباً دونوں کا خذ ایک ہی ہے۔ چونکہ یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں لہ فرانسیسی میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اس لئے ان کی حکایت اخلاصہ بیان کرنا کافی ہوگا۔

۸۷۰ء میں ابن وہب نے چین کا سفر کیا، اور نہنشاہ سے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی، اور یہ بھی بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں ہوں، صدیق کرنے کے بعد شہنشاہ نے حاضری کی اجازت دیدی ور انھیں تصویروں کا ایک مجموعہ دکھایا جس میں بہت سے انبیاء کی تصویریں کاغذ کے بیلن پر بنی ہوئی تھیں۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کی تصویر دیکھ کر انھوں نے کہا کہ یہ تو نوح علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا مشہور عصا لئے ہوئے دیکھ کر پہچان لیا او حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گدھے پر سوار دیکھ کر۔ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی، آپؐ اونٹ پر سوار تھے، آپؐ اور آپؐ کے ہمراہی عربی طرز کے چپل پہنے ہوئے تھے اور پیٹی میں مسواک لگی ہوئی تھی۔ دوسری تصویروں کو وہ نہیں پہچان سکے۔ شہنشاہ نے بتایا کہ یہ ہندوستان اور چین کے پیغمبر ہیں، ہر تصویر پر غالباً چینی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ہمارے سیاح سے شہنشاہ نے ایک ترجمان کے ذریعے گفتگو کی۔

چین کا ایک عجیب و غریب قصہ سنانے سے پہلے ایک بات اور عرض کر دوں، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے درمیان تحائف کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اگر حضرت دانیالؑ کے مزار کے عجائبات ایران سے بازنطین جا پہنچے تو یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ اسی مقام سے تصویروں کی ایک نقل چین بھی گئی ہو۔ ہر دربار کے مصوروں نے اپنے اپنے بادشاہ کے لئے اپنی فنی روایتوں کے بموجب اعلیٰ معیار کی نقل تیار کی ہوگی۔

چین کا دوسرا قصہ جسے پہلے قصے کی ترقی یافتہ، بلکہ تنزل یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے، چینی ماخذ سے ہی ملا ہے۔ میں جناب میشل والساں صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ازراہ نوازش یہ حوالہ عنایت فرمایا۔

۱۸۷۸ء میں دار بی دتیرساں (Darby de Thier Sant) نے فرانسیسی میں ایک کتاب "چین اور مشرقی ترکستان میں اسلام" دو جلدوں میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک اقتباس چینی کتاب "تاؤ کو اُون تسی" (Tao - Kon - ouen - Tsy) سے دیا ہے یہ چینی کتاب قدیم روایت سے متعلق ادبی نوادرات

---

[1] عربی متن ۱۸۱۱ء میں لانگ لے نے "سلسلۃ التواریخ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ ۱۸۴۵ء میں رینو نے "سفر کا قصہ" کے نام سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ دوسرا ترجمہ ۱۹۲۲ء میں فیراں نے "تاجر سلیمان کا سفر ہندوستان اور چین میں" کے نام سے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں "اخبار الصین والہند" کے نام سے سوواژے نے عربی متن شائع کیا، مگر افسوس ہو کہ یہ حصہ چھوڑ دیا ہے (لانگ لے کی کتاب میں صفحہ ۷۷ تا ۸۰۔ رینو کے ترجمے میں صفحہ ۷۹ تا ۸۹۔ فیراں کے ترجمے میں صفحہ ۷۷ تا ۸۳)

[2] "مروج الذہب" جلد اول صفحہ ۳۱۲ تا ۳۱۹۔

...... کا مجموعہ ہے جسے ہانگ چی تسوئن (Hang - chi - Tsuen) نے مرتب کیا ہے۔ اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

"ایک چینی مسلمان مصنف جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی ہے اپنی کتاب میں یہ قصہ سناتا ہے کہ ۶۰۲ء میں چین کے شہنشاہ نے پیغمبر اسلام کو اپنی سلطنت میں تشریف لانے کی دعوت دینے کے لئے ایک سفارت عرب روانہ کی، مصنف کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذر فرما دیا اور اپنے بجائے اپنی تصویر بھیجدی۔ یہ تصویر کپڑے پر اس طرح بنائی گئی تھی کہ مقررہ وقت گزر جانے پر کپڑے سے خود بخود اڑ جائے۔ یہ احتیاطی تدبیر آپ نے اس خیال سے اختیار فرمائی تھی کہ آپ کی شبیہ کو کہیں کوئی تبدیل یا خراب نہ کر ڈالے۔" (جلد اول صفحہ ۲۷)

داربی ویٹرساں اس واقعہ کا دوبارہ ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تیئن فانگ تیئن لی (Tien - fang - che - tien) کی تصنیف کے مطابق ـــــ

"تانگ خاندان کے عہد سلطنت میں شہنشاہ ہیون تسونگ (Hiven Tsong) نے آپ کو تشریف لانے کی دعوت دینے کی غرض سے ایک ایلچی بھیجا، مگر آپ نے انکار فرمایا۔ ایلچی آپ کی تصویر لے کر واپس آیا۔ شہنشاہ نے تصویر اپنے محل میں لٹکادی۔ اور اس کی پرستش کرنے لگا۔ فوراً ہی تصویر غائب ہوگئی۔" (جلد دوم صفحہ ۲۳)

وزی گوتھ دور کے اندلس میں

اس کا ذکر یوں تو دوسرے مصنفوں کے یہاں بھی ملتا ہے، لیکن جب سے مقری کی "نفح الطیب"[۱] کا ترجمہ ہوا ہے، یہ قصہ کافی مشہور ہو چکا ہے کہ ٹولیڈو کے مقام پر ایک طلسمات کا محل تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کھانے کی میز رکھی تھی، اور ایک گنبد میں ایک موم جامے کا ٹکڑا بند تھا، گنبد کے اوپر شہسواروں (یعنی عرب شہسواروں) کی تصویریں بنی تھیں، اور موم جامے کے ٹکڑے پر لکھا تھا:

"اس محل اور اس گنبد کو حکمت نے بند کیا ہے، جب یہ کھل جائیں گے تو اندلس کے جزیرہ نما میں وہ قوم داخل ہوگی جس کی تصویریں گنبد پر بنی ہوئی ہیں، جو لوگ اس قوم کا مقابلہ کریں گے انکی سلطنت غائب ہو جائے گی اور ان کی حکمت بھی اٹھ جائیگی" دراصل اس سے مراد ہے وزی گوتھ خاندان کا خاتمہ اور شاہ روڈرک کی موت۔

نتیجہ

ان سب حکایتوں پر داستان سرائی کی متعدد اور گھرے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن دو چیزیں خاص طور سے غور کے قابل ہیں۔ ایک تو ماخذ کا تنوع، دوسرے موضوع کی وحدت یعنی ان سب حکایتوں میں تصویر کی روایت موجود ہے۔ آئندہ زمانے میں آنے والی کسی شخصیت یا واقعے کا انتظار ایک ایسی چیز ہے جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے، یہودیوں کے یہاں، برہمنوں کے یہاں، بدھوں کے یہاں، زرتشتیوں اور عیسائیوں کے یہاں۔ اور یہ روایت کہ ہم حنوک کے دور سے ملتی ہے (یہوداہ کا عام خط۔ آیت ۱۵، ۱۶)

اس کے باطنی پہلو سے تو یہاں ہمیں مطلب نہیں اس چھوٹے سے مضمون کا اصل مقصد تھا کہ بکھرے ہوئے شواہد کو جمع کر لیا جائے، اور وہ رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے جس سے یہ سب حکایات آپس میں منسلک ہو جاتی ہیں، ان حکایات کو محض داستان سرائی کہہ کر رد کر دینا تو آسان کام ہے، مگر غالباً میرے تمام قاری اتنی شدید تشکیک پسندی نہیں برتیں گے، نتائج ہر شخص اپنی جگہ مرتب کر لے گا۔

(یہ مضمون ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بزبان فرانسیسی لکھا، اور ہولینڈ کے ایک رسالے میں ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا، اردو ترجمہ محمد حسن عسکری نے کیا۔ لاطینی عبارتوں کا اردو میں ترجمہ خود جناب مصنف نے کیا ہے)

---

[۱] دیکھئے باب اول حصہ دوم۔ یہ قصہ فاطمی دربار کے قاضی رشید ابن الزبیر کی کتاب "الذخائر والتحف" (تقریباً ۴۶۲ھ یا ۱۰۷۰ء) میں بھی ملتا ہے جسے میں نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا محمد طاسین صاحب - ناظم مجلس علمی کراچی

معاشی توازن اور اسلام

اسلام، نوع انسان کے ہر فرد کو مستقل اور جداگانہ حیثیت دیتا اور اس کی فلاح و بہبود کو اپنا اصل مقصد اور مطمح نظر ٹھہراتا ہے، لیکن اس کے نزدیک فرد کی فوز و فلاح کا جو تصور ہے وہ راہبانہ اور جوگیانہ قسم کا نہیں جو فطری و جبلی تقاضوں کو مٹانے اور دنیا سے پوری طرح قطع تعلق کرنے سے حاصل ہوتا ہو بلکہ وہ ایسا تصور ہے جو صرف ایک ایسے معاشرے ہی میں حاصل ہو سکتا ہے جس میں اعتدال و توازن کے ساتھ انسان کی جملہ مادی اور روحانی ضرورتوں کا پورا انتظام ہو۔

کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آخرت سے پہلے یہاں اس دنیا میں بھی ہر فرد و بشر کو ایسی حیاۃ طیبہ اور حیات حسنہ میسر آئے جو ہر قسم کے خوف و حزن سے پاک اور ہر طرح کے امن و اطمینان سے معمور ہو، لیکن وہ امن و اطمینان، فطری اور جبلی تقاضوں کو مٹا کر نہیں بلکہ ان کی تکمیل اور تسکین سے حاصل ہوا ہو، نیز وہ امن و اطمینان، عارضی، وقتی اور محدود نہیں بلکہ مستقل، دائمی اور غیر محدود ہو، اس لئے کہ دراصل یہی وہ فطری مطلوب ہے جس کی طلب و خواہش ہر انسان کے اندر پیدائشی اور اضطراری طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو پانے اور حاصل کرنے کے لئے ہر انسان شعوری و غیر شعوری طور پر عمر بھر گوناگوں سعی و کوشش اور جدوجہد میں مصروف اور منہمک رہتا ہے اور جس کے حاصل ہو جانے ہی کا نام انسانی فوز و فلاح اور بشری کامیابی و کامرانی ہے۔ ظاہر ہے کہ فرد کو اس کی یہ مطلوبہ زندگی، آباد دنیا سے الگ تھلگ ہو کر جنگلوں اور غاروں کی تنہائیوں میں نہیں مل سکتی بلکہ صرف ایک ایسے معاشرے میں مل سکتی ہے جو ایک طرف اپنے اندر ہر قسم کا وہ جملہ مادی و معنوی سروسامان رکھتا ہو جس سے انسان کے فطری اور جبلی تقاضوں کو تسکین ملتی اور اس کی زندگی میں امن و اطمینان پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف حقوق کے ٹھیک ٹھیک تحفظ کی بنا پر اس میں مکمل اعتدال و توازن پایا جاتا ہو، کیونکہ اس کے بغیر امن و اطمینان میں استقلال اور دوام پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ عارضی اور ناپائیدار رہتا ہے۔

بنا بریں اسلام فرد کی فلاح و بہبود کی خاطر معاشرے کے قیام کو ضروری ٹھہراتا اور فکر و عمل کے لیے اصول و ضوابط دیتا ہے جن پر عمل کرنے کے نتیجہ میں ایک ہر لحاظ سے معتدل و متوازن معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے
ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان
اتاری تاکہ انسانیت عدل وقسط کے سہارے
کھڑی ہو جائے۔

اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی
ہدایت کے لئے وحی و رسالت کا جو مقدس سلسلہ قائم فرمایا
اس سے ایک بڑا منشا و مقصود یہ تھا کہ یہاں دنیا میں
ایک ایسا انسانی معاشرہ وجود میں آئے جو عدل وقسط کی
بنیاد پر استوار اور جس میں مکمل اعتدال و توازن پایا جاتا ہو
کیونکہ اس کے بغیر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے فرد کو پائیدار
امن واطمینان کی وہ خوشگوار زندگی نصیب نہیں ہوسکتی جس کی
ہر انسان کے اندر فطری طور پر طلب و آرزو پائی جاتی ہے،
نیز اس کے بغیر فرد کی وہ خلاقی صلاحیتیں پوری طرح بروئے
کار نہیں آسکتیں جو کائنات کو مسخر کرنے اور اس سے فائدہ
اٹھانے کی غرض سے اسے ودیعت کی گئی ہیں اور جن کے زیادہ
سے زیادہ بروئے کار آنے سے تمدنی خوشگواریوں اور انسانی
راحت وسکون میں زیادہ سے زیادہ اضافہ رونما ہوتا ہے

بہر حال اس میں کچھ شک وشبہ نہیں کہ اسلام معاشرہ
انسانی کے ہر پہلو میں معاشی ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا اخلاقی
تعلیمی ہو یا تہذیبی مکمل اعتدال و توازن چاہتا ہے اور خصوصیت
کے ساتھ معاشی پہلو کے اعتدال و توازن پر بہت زیادہ زور
دیتا ہے کیونکہ در اصل اس پر بڑی حد تک دوسرے کئی
پہلوؤں کے اعتدال و توازن کا دار و مدار ہوتا ہے یعنی
جس طرح معاشی عدم توازن سے معاشرے میں طرح طرح کی
اور گوناگوں اخلاقی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفاسد
پیدا ہوتے اور بالآخر اس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں
اسی طرح معاشی توازن سے بھی بہت سی اخلاقی، سیاسی
اور معاشرتی بے اعتدالیاں اور بدعنوانیاں خود بخود ختم
ہو جاتی اور معاشرہ بڑی حد تک درست اور ٹھیک ہو جاتا ہے
گویا معاشی توازن وعدم توازن پر اگر تمام تر نہیں تو بہت بڑی
حد تک معاشرے کے صلاح وفساد اور بناؤ و بگاڑ کا انحصار
ہوتا ہے حتیٰ کہ خالص مذہبی اعمال تک اس سے متاثر ہوتے
ہیں توازن کی صورت ہو تو ان میں اخلاص کا رنگ غالب
اور عدم توازن کی صورت میں ریاکاری کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں میرا مقصد نہ تو ان معاشی اصولوں
کو پیش کرنا ہے جن پر عمل کرنے سے معاشرے میں معاشی
اعتدال و توازن پیدا ہوتا ہے، اور نہ اسلام کے اس
طریق کار اور منہاج پر روشنی ڈالنا ہے جس سے وہ اپنے
معاشی اصولوں کو عملی جامہ پہناتا اور روبکار لاتا ہے بلکہ صرف
یہ بتلانا ہے کہ اسلام کے نزدیک معاشی توازن کا وہ تصور
کیا ہے جس کو وہ معاشرے میں پیدا کرنا اور برقرار رکھنا
چاہتا ہے۔

اسلامی نظام حیات کا جو مقصد وجود ہے نیز اس کے
معاشی اصولوں میں جو عملی نتائج پیدا کرنے کی عقلی صلاحیت
ہے اس کے پیش نظر معاشی توازن کا مفہوم یہ متعین ہوتا ہے
کہ معاشرے کے ہر ہر فرد کو دو چیزیں ضرور حاصل ہوں
ایک بقدر ضرورت سامان معاش، یعنی کسی نہ کسی شکل میں
کم از کم اتنا سامانِ معاش ہر فرد کو ضرور میسر ہو جس کے
بغیر عام طور پر ایک انسان نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا
ہے اور نہ اپنے متعلقہ فرائض کو ٹھیک طریقہ سے ادا کر سکتا
ہے جو مختلف حیثیات سے اس کے ذمہ پر عائد ہوتے ہیں
اور جن کی ادائیگی پر معاشرے کے بقا اور استحکام کا دارومدار
ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ ہر فرد کو معاشی ترقی یعنی ضرورت
سے زیادہ مال ومتاع حاصل کر سکنے کا موقعہ حاصل ہو آگے
اس کی مرضی کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔

کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ کہ بلا کسی تخصیص وامتیاز
اور بلا کسی تفریق واستثنا کے معاشرے کے ہر ہر فرد کو
گو سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی معیار پر ہی لیکن ضرورت

تک غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم کی سہولت حاصل
ی کوئی فرد بھوکا، ننگا، بے گھر، مریض اور جاہل نہ ہو بلکہ کسی
درجہ میں ہر ایک کے لئے بنیادی ضروریات کا لازماً انتظام
اور دوسرے ہر فرد کے لئے معاشی ترقی کا راستہ کھلا ہوا ہو
ہ ضرورت سے زیادہ مال و متاع اور سازوسامان حاصل
چاہے تو اپنی صلاحیت کے مطابق جائز طریقوں سے حاصل
ے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک معاشی توازن کا
ب یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے بعض افراد، بنیادی ضروریات
ے محروم ہوں۔ سادہ سے سادہ شکل میں بھی ان کے پاس اتنا
ی سروسامان موجود نہ ہو جو اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے او
تہ ذمہ داریوں کو ٹھیک طرح سے انجام دینے کے لئے ضروری
یا یہ کہ بنیادی ضروریات سے تو کوئی محروم نہ ہو لیکن معاشی
کے مواقع صرف بعض کو حاصل ہوں اور دوسرے بعض ان سے
م ہوں، یہ دونوں صورتیں معاشی عدم توازن کی ہیں اور اسلام
دونوں کے خلاف ہے۔

غرضیکہ اسلام جس قسم کا معاشی توازن چاہتا ہے وہ یہ نہیں کہ
شرے کے تمام افراد معاشی معیار کے لحاظ سے بالکل یکساں اور
بر ہوں جتنا اور جیسا معاشی سازوسامان اور مال و متاع ایک
پاس ہو اتنا اور ویسا ہی ہر دوسرے کے پاس بھی ہو، غذا، لباس
ن، علاج و تعلیم اور ضرورت سے زیادہ مال و دولت میں کامل مساوات
بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کمیت و کیفیت کے تفاوت اور مقدار
نوعیت کے اختلاف کے ساتھ ہی لیکن کوئی فرد ایک تو بنیادی
روریات اور دوسرے معاشی ترقی کے مواقع سے محروم نہ ہو۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ جس معاشرے کے بعض افراد سرے
ے بنیادی ضروریات ہی سے محروم ہوں اور ان کے پاس کسی
شکل میں ضرورت کی حد تک بھی سامان معاش موجود نہ ہو جبکہ
دوسرے بعض کے پاس تعیش اور تکلف کی حد تک نہایت
کثرت اور فراوانی کے ساتھ موجود ہو، یا یہ کہ ضرورت کی حد
تک تو کسی نہ کسی درجے میں سب کے پاس موجود ہو لیکن ضرورت سے
زیادہ حاصل کرسکنے کے مواقع صرف بعض افراد کو حاصل ہوں
اور دوسرے بعض ان سے محروم ہوں ان دونوں صورتوں
میں معاشرہ اعلیٰ و ادنیٰ دو مختلف معاشی طبقوں میں منقسم
ہو جاتا ہے ایک طبقہ معاشی طور پر مطمئن و خوشحال اور غنا،
و تونگری میں برابر بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور دوسرا
طبقہ پریشان و بدحال یا خوشحالی کی ایک خاص حد تک
رکا رہتا ہے اُس سے آگے نہیں بڑھ پاتا اس لئے کہ معاشی
ترقی کے راستے اُس پر مسدود ہوتے ہیں، اول الذکر طبقہ
کو چونکہ ثانی الذکر طبقہ پر معاشی برتری حاصل ہوتی ہے۔
لہذا وہ اس پر اپنی سیاسی اور معاشرتی برتری بھی قائم
کرتا اور نہ صرف یہ کہ اس کو ماتحت رکھتا بلکہ لبسا اوقات
اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرتا اور حقارت آمیز رویئے
سے پیش آتا ہے جس سے قدرتی ردعمل کے طور پر دوسرے
طبقہ کے دل میں پہلے طبقہ کے متعلق حسد و بغض کے جذبات
پرورش پاتے اور بڑھتے بڑھتے نفرت و عداوت میں تبدیل
ہو جاتے ہیں، کچھ عرصہ تک ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے
نزاعات پیدا ہوتے اور دب جاتے ہیں لیکن بالآخر ایک
ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ ان کے مابین شدید نزاع و تصادم
رونما ہوتا اور باہمی جنگ و جدال کا بازار گرم ہو جاتا ہے
جس کا نتیجہ پورے معاشرے کے لئے تباہی و بربادی اور
عام بدامنی اور بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ گویا معاشی
عدم توازن کی صورت میں معاشرے کے بعض افراد کو جو امن
و اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ پائدار اور مستقل نہیں ہوتا بلکہ
ناپائیدار اور عارضی ہوتا ہے اس کی پشت پر خواہ کیسے ہی
حفاظتی انتظامات ہوں وہ ضرور زائل ہو کر رہتا ہے اور کوئی
تدبیر اس کو زوال سے بچا نہیں سکتی اس لئے کہ دراصل اس کی بنیاد
ظلم و حق تلفی پر ہوتی ہے اور ظلم چونکہ نظام فطرت کے مخالف
اور منافی ہے لہذا وہ کچھ وقت تک تو ضرور قائم رہ سکتا ہے لیکن
ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔

ادھر چونکہ اسلام کا منشا ر مقصود یہ ہے کہ عدل و
قسط کی بنیاد پر ایک ایسا مثالی معاشرہ وجود میں آئے جس کے
ہر ہر فرد کو پائدار امن و اطمینان اور دائمی راحت و سکون کی
وہ خوشگوار زندگی نصیب ہو جس کی ہر فرد بشر کے اندر فطری
اور پیدائشی طور پر طلب و خواہش پائی جاتی ہے لہذا اس کے
نزدیک معاشرے کی ہر وہ حالت غلط اور باطل ہے جس کا آخری
نتیجہ معاشرے میں بدامنی و بے چینی کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہو

معاشرے میں معاشی توازن بروئے کار لانے کے لئے
اسلام ایک طرف ایسے اصول دیتا ہے جن پر عمل کرنے کے لازمی
نتیجہ میں بلا تخصیص و امتیاز ہر فرد کو ضرورت کی حد تک کسی نہ کسی
شکل میں سامان معاش بھی میسر آجاتا ہے، نیز ہر ہر فرد کو معاشی
ترقی کا جائز اور مناسب موقعہ بھی مل جاتا ہے، دوسری طرف
وہ اپنے عقائد کی تعلیم اور عبادات کی تربیت کے ذریعہ ایسا
ذہنی ماحول تیار کرتا ہے جس میں افراد بغیر کسی خارجی دباؤ اور بیرونی
جبر کے محض اپنی آزاد مرضی اور اندرونی تحریک سے ان اصولوں
پر کاربند اور عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔

اس کے بالمقابل نظام سرمایہ داری کے جو معاشی اصول
ہیں وہ اپنی فطری ساخت کے لحاظ سے ایسے ہیں کہ ان سے کبھی بھی
مذکورہ بالا قسم کا معاشی توازن پیدا ہی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے
برخلاف ان سے لازمی طور پر ایک نہایت ہی غیر متوازن اور بیحد
ناہموار معاشی ماحول وجود میں آتا ہے جس میں ایک طرف افراد کی
بہت بڑی اکثریت معاشی بدحالی اور پریشانی کا شکار رہتی ہے
اور اس کو انتہائی جد و جہد اور دوڑ دھوپ کے باوجود صرف
اتنا ملتا ہے جس سے اس کا بمشکل گذارہ ہوتا ہے اور دوسری
طرف تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو بے حساب
و بے شمار مال و دولت کے مالک اور جن کے قبضہ میں پیداوار
رزق کے تمام وسائل و ذرائع اور معاشی ترقی کے جملہ
مواقع ہوتے ہیں لہذا وہ اکثریت کو من مانے طریقہ سے استعمال
کرتے اور اپنی دولت برابر بڑھاتے چلے جاتے ہیں، اکثریت
کبھی تنگ و پریشان ہو کر اجرتوں میں زیادتی کا مطالبہ
اور احتجاجاً ہڑتال مناتی ہے تو یہ لوگ حکومت کے توسط
سے جو دراصل انہی کی ہوتی ہے کچھ بڑھا کر وقتی طور پر ا
خاموش کر دیتے ہیں، بہرحال چونکہ یہ نظام ظلم و حق تلفی پر
ہوتا ہے لہذا وقتاً فوقتاً اس میں ایسے حالات پیدا
رہتے ہیں جو پورے معاشرے کے لئے پریشانی و بے چینی کا
بنتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس نظام میں افراد کو ایک
طرح کی آزادی ضرور حاصل ہوتی ہے جس کو وہ اپنی پریشانی
کا مداوا اور نعم البدل سمجھتے اور کچھ دل بہلا لیتے ہیں۔

اسی طرح اشتراکیت کے جو معاشی اصول ہیں وہ اگرچہ
سرمایہ داری کے معاشی اصولوں کے مقابلہ میں بہت بہتر
اور ان میں عمومی خوش حالی کی زیادہ صلاحیت ہے، ان سے
ملکی دولت چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے پورے معاشرے
میں پھیلتی اور زیادہ سے زیادہ افراد کو اس سے فائدہ
اور پھولنے پھلنے کا موقعہ ملتا ہے لیکن اس میں چونکہ پیداوار
دولت کے جملہ وسائل و ذرائع قومی ملکیت اور عملاً حکومت
کے قبضہ میں ہوتے ہیں اور حکومت بھی باقاعدہ منصوبہ
کے تحت افراد کو کام پر لگاتی اور اجتماعی مصالح کے پیش نظر
ان کے لئے مناسب اجرتیں مقرر کرتی ہے افراد کی آزاد مرضی
کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا، اسی طرح چونکہ اشتراکیت کے
پاس اللہ اور اخروی جزاء و سزا کا کوئی تصور نہیں اسی حالات
کو درست رکھنے کے لئے تمام تر حکومتی جبر اور خارجی دباؤ سے کام
لینا پڑتا ہے، بنابریں اشتراکی نظام میں افراد کو آزادی کی
وہ نعمت نصیب نہیں ہوتی جو اسلامی نظام اور سرمایہ داری
نظام میں نصیب ہوتی ہے؛ علاوہ ازیں اشتراکی نظام
میں جو معاشی توازن ہوتا ہے وہ چونکہ بعض غیر فطری بنیادوں
پر اور جبر کے ذریعہ قائم ہوتا ہے لہذا جبر اٹھنے کے بعد اس
میں ردعمل کا ظاہر ہونا ایک لازمی امر ہوتا ہے جس کا نتیجہ پورے
معاشرے کے لئے عام بدامنی و بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اوپر جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر اگر کوئی یہ سوال
ٹھے کہ آپ نے معاشی توازن کا جو اسلامی تصور پیش کیا ہے
ہ آج کسی بھی اسلامی معاشرے میں عملاً موجود ہے، تو اسکا
ب نہایت افسوس کے ساتھ میں یہ عرض کروں گا کہ چونکہ
ی سے آج کسی مسلمان معاشرے کا معاشی نظام، اسلام
معاشی اصولوں پر استوار نہیں بلکہ بیشتر کا معاشی نظام،
یہ داری کے اصولوں پر اور بعض کا نیم اشتراکی اصولوں پر
م ہے لہٰذا ان میں وہ معاشی توازن کیسے ظہور پذیر ہو سکتا ہے
جو صرف اسلام کے معاشی اصولوں پر عمل کرنے کے نتیجے میں
ہو سکتا ہے؟

اسلام کے وہ معاشی اصول کیا ہیں جن کی عملی شکل سے مذکورہ
بالا قسم کا معاشی توازن وجود میں آتا ہے. دراصل یہ ایک مستقل اور
نہایت اہم موضوع ہے جس پر اگر اللہ نے چاہا اور اس کی توفیق شامل
حال ہوئی تو عنقریب ایک مفصل مضمون پیش کرنے کا ارادہ ہے
واللہ ہو الموفق۔

جناب ڈاکٹر محمد عبد اللہ صاحب

سلام

زائرو عرض کرو تم میرے آقا کو سلام
میری جانب سے میرے قبلہ و کعبہ کو سلام

مجھ سے عاصی کو ضرورت ہی نہایت جن کی
مظہر رحمتِ حق، ملجا و ہادی کو سلام

حُسن جس کا ہے مرے حسن تصور سے حسیں
والہانہ مرا اس حسنِ سراپا کو سلام

جن کی تعلیم سے پاتے ہیں شفا دل کے مریض
پیکر علم و عمل رشک مسیحا کو سلام

جس طرف سے بھی وہ گذرے ہیں جہاں بھی جب بھی
اس گلی کوچہ کو اور وادیٔ بطحا کو سلام

سب کے احسان اور انعام ہیں مجھ عاصی پر
جملہ اصحابؓ شہنشاہِ مدینہ کو سلام

نیمورائڈ: بواسیر کی تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک بہترین مرہم ہے۔ یہ بواسیری مستوں پر مسکن و مانع عفونت اثر کرتا ہے اور انہیں سکیڑ کر ختم کر دیتا ہے۔ 'نیمورائڈ' کے چند ٹیوب استعمال کرنے سے بواسیری خون، ورم، داد اور خارش کو قطعی افاقہ ہوتا ہے۔

نیمورائڈ

بواسیر کا بہترین علاج

ہمدرد (وقف) لیبوریٹریز
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ

جناب ڈاکٹر غلام جیلانی برق
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب "اسلام"

آج سے کچھ عرصہ پیشتر جب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے خلاف یہ شور اٹھا۔ کہ آپ اسلام کو بدل رہے ہیں قرآن کو تصنیف رسول قرار دے رہے ہیں۔ اور اسلام کے متعلق ذہنوں میں شکوک پیدا کر رہے ہیں۔ تو میں نے آپ کی دو کتابوں کا مطالعہ کیا۔ "اسلامک میتھڈولوجی ان ہسٹری" اور "اسلام"۔ اول الذکر تو پڑھنے کے بعد میرا تاثر یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے "سنّت" کو حضور صلعم اور صحابہ کبار کے قول و عمل تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے مسلمانوں کے مقبول عمل کو خواہ وہ کسی دور سے تعلق رکھتے ہوں۔ سنّت کہہ دیا ہے۔ لغوی لحاظ سے آپ یقیناً صحیح تھے لیکن انھیں ایک مسلمہ اصطلاح میں جس کا مفہوم ہر دور میں اور ہر مقام پر ایک ہی سمجھا جاتا رہا اتنے بڑے معنوی تغیر کا حق حاصل نہیں تھا، اگر ہم سنّت کا یہ نیا مفہوم قبول کر لیں، تو ممکن ہے کہ آج سے پچاس برس بعد پارلیمان کا کوئی ممبر یہ قرارداد پیش کر دے کہ پاکستان کے فلاں اہم شہر میں مے نوشی، رقص اور مرد و زن کا آزادانہ اختلاط مقبول ہو کر اس شہر کی "سنّت" بن چکا ہے۔ اس لئے اس سنّت کو پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی رائج کیا جائے۔

اسلام ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتاب کا نام "اسلام" ہے جس کے آغاز میں آپ نے نبوت اور نزول وحی پر بھی بحث کی ہے، اس بحث کا جائزہ لینے سے پہلے دینی امور پر قرآن کی تصریحات پیش کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں بار بار کہتا ہے، کہ یہ کتاب ہم نے اتاری ہے ہمارا قاصد روح الامین یعنی جبریل ہے، وہ نہایت امانت دار ہے، اپنی طرف سے کوئی بات وحی میں شامل نہیں کرتا ہے وہ ایسا کرے تو

لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (الحاقہ - ۴۶)

(ہم اس کی رگ جان کاٹ دیں)

وہ نہایت طاقتور، عظیم، صاحب قوت۔ شدید و مہیب ہے۔ آسمانوں کے تمام ملائکہ اس کے مطیع ہیں۔ وہ اللہ کا پیغام اپنے الفاظ میں رسول تک پہنچاتا ہے۔ جب پیغام زبانی ہو تو ظاہر ہے کہ مرسل الیہ تک یہ صرف قاصد کی آواز پہنچے گی۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۔ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ ۔ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۔ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ

الْمُبِيْنِ - وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ
(تکویر ۱۹ - ۲۴)

(یہ قرآن ایک معزز قاصد (جبریل) کا قول ہے جو صاحب قوت اور رب العرش کے ہاں محترم ہے وہ (آسمانوں میں) مطاع ہے۔ نیز امین تمہارا یہ رفیق (حضور صلعم) جن زدہ نہیں ہے (بلکہ اس کے منہ سے اللہ کا کلام نکلتا ہے) اس نے ایک دفعہ اس قاصد کو اُفقِ اعلیٰ پہ دیکھا تھا)

جبریل کیسے نازل ہوتا تھا؟ اس کی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ - مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ - وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ - عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ - ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ - وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ (النجم ۱ - ۱۴)

(تارے کی قسم جب وہ غروب ہو۔ کہ تمہارا رفیق رہ راست سے نہیں بھٹکا، وہ دل سے باتیں نہیں گھڑتا، بلکہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے جس کی تعلیم اسے ایک عظیم طاقتوں والے مہیب فرشتے نے دی ہے ہوا یوں کہ[1] یہ فرشتہ ایک بلند افق پہ نمودار ہوا۔ پھر نیچے اترا، اور اس حد تک رسول کے قریب آگیا۔ کہ دونوں میں قوسین کا فاصلہ رہ گیا۔ پھر اس نے جو پیغام دینا تھا۔ دیا۔ رسول کے دل نے اس کی آنکھوں کی تصدیق کر دی۔ کیا تم رسول کے مشاہدات پر اس سے جھگڑتے ہو! اُس نے اس فرشتے کو دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا تھا)

پیغام پہنچانے کی صورت کیا تھی؟ اس کا کوئی واضح تصور قرآن میں موجود نہیں۔ کفار کا ایک الزام یہ تھا کہ محمد (صلعم) کے منہ سے کوئی جن بولتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب جن کسی فرد پر مسلط ہو جاتا ہے تو اس کے شعور و حواس کو اپنے بس میں لے کر اس کے منہ سے اپنی باتیں نکلواتا ہے میں نے ایک جن زدہ عورت کو دیکھا کہ وہ فصیح انگریزی بول رہی تھی، حالانکہ وہ ان پڑھ تھی، ممکن ہے کہ وحی کی صورت بھی یہی ہو کہ وہ شدید القویٰ فرشتہ جو اللہ کے بعد کائنات کی عظیم ترین طاقت ہے۔ رسولؐ کے تمام قویٰ کو اپنے بس میں لے کر اللہ کا پیغام اس کی زبان پہ جاری کر دیتا ہو۔[2] سنہ ۱۹۳۳ء میں مجھے ایک عجیب منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ بنگال کے ایک ہندو جادوگر نے ایک لڑکی کو ہپناٹزم کے زور سے سلا دیا اور پھر میرے ساتھی سے ایک کتاب لے کر کوئی صفحہ کھول لیا اور کہا کہ میں یہ صفحہ دل میں پڑھوں گا اور یہ لڑکی بلند آواز سے پڑھے گی، اور ایسا ہی ہوا۔

انسانی دماغ ایک پُر اسرار کائنات ہے اس کے رموز و اسرار کو سمجھنا کھیل نہیں۔ دماغ پر وحی کا نزول کیسے ہوتا ہے، الفاظ کہاں سے آتے ہیں اور زبان پہ کیسے جاری ہو جاتے ہیں؟ ایک ایسا معمہ ہے جو شاید کبھی حل نہ ہو۔

---

[1] حضرت تھانوی اور شاہ رفیع الدین نے یہی ترجمہ کیا ہے ۱۲ [2] اور جیسا کہ برق صاحب نے آگے تحریر فرمایا ہے اس کے لئے تاویل کی بھی ضرورت نہیں براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے الفاظ قوت سامعہ کے ذریعہ سنا دینے میں کیا اشکال ہے؟ بخاری کی صحیح احادیث بھی اس پر دلالت کرتی ہیں — مدیر

اوپر کے دو واقعات (جن اور لڑکی کا قصہ) سامنے رکھ کر ذرا اس آیت پر غور فرمایئے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ۔ (جن ۲۶ - ۲۸)

(اللہ عالم الغیب ہے وہ غیب کی باتیں (وحی) صرف اسی کو بتاتا ہے، جسے رسالت کے لئے منتخب کرلے۔ اللہ (نزول وحی کے وقت) رسول کے آگے پیچھے پہرے لگا دیتا ہے (تاکہ کوئی شیطانی آواز وحی میں شامل نہ ہو جائے) اور اللہ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ فرشتوں نے اس کے پیغامات رسول تک صحیح صحیح پہنچا دیئے ہیں)

ان آیات سے دو باتیں واضح ہیں۔ اول۔ کہ جبریل ایک مستقل ہستی ہے، جس کا کام رب العرش کا پیغام رسولوں تک پہنچانا تھا۔ دوم کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور وہ اللہ ہی کا کلام رہے گا، خواہ اس کی تلاوت فاروق رضؓ و صدیق رضؓ کریں۔ یا رسولِ مقبول صلعم۔ نزول وحی کے وقت حضور صلعم کی زبان مقدس پر آیات کا جاری ہو جانا تلاوت ہی کی ایک صورت تھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ قول :-

"کہ ایک لحاظ سے قرآن رسول کا کلام بھی ہے"۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۶۸ء میگزین ص ۳ کالم ۶)

صحیح نہیں۔ اور نہ ذیل کی بات صحیح ہے :-

"بہت سی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ محمد (صلعم) جبریل سے باتیں کیا کرتے تھے اور جبریل انھیں نظر آتا تھا، لیکن یہ چیز قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے[1] جبریل تمہارے دل پر اتارا ہے یہ کہ تم لوگوں کو ڈراؤ۔ جبریل کے خارجی حقیقت ہونے اور وحی کے نزول کا عقیدہ مسلمانوں کے دماغ میں یوں گھس چکا ہے کہ اب وہ حقیقت کو گالی سمجھتے ہیں"۔

(ملخص "اسلام" ص ۱۳)

اسی مضمون کو ایک اور مقام پر یوں ادا کرتے ہیں

"لیکن آرتھوڈاکسی[2] نے احادیث یا روایات جن کی تشریح حسبِ خواہش کی گئی تھی، اور یا جو تراش لی گئی تھیں۔ یا اس دینیات کی بنا پر جس کی بنیاد احادیث پر ڈالی گئی تھی یہ عقیدہ گھڑ لیا۔ کہ پیغام وحی کان کی راہ سے دل تک آتا ہوگا، اور پیغام لانے والی ایک خارجی ہستی تھی"۔

(ملخص "اسلام" ص ۳۱)

کان اور آنکھ محض آلات ہیں، سماعت اور بصارت دماغ کا کام ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ جبریل وحی کو قلب تک پہنچانے کے لئے حضور صلعم کی سماعت کو بھی استعمال کرتا تھا، تو اس میں حرج کیا ہے؟ اور یہ کس آیت کے خلاف ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون (پاکستان ٹائمز اشاعت ۲۵ اگست ۱۹۶۸ء) میں شاہ ولی اللہ اور حکیم

---

[1] نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ ...... کا یہ ترجمہ صحیح نہیں "اسلام" ص ۱۳ پر اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے "ایک معتبر روح یا فرشتے نے یہ قرآن تمہارے دل پر اتارا ۔۔۔۔۔۔ اور یہی ترجمہ درست ہے، دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

[2] آرتھوڈاکس" لفظ میں کوئی خرابی نہیں، لیکن مستشرقین ہمارے ہمیشہ دقیانوسی، بے کار اور پرانی چیزوں کے لئے استعمال کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس لفظ کا فیاضانہ استعمال کیا ہے، اور ہمارے تمام ائمۂ حدیث و فقہ کو آرتھوڈاکس کہا ہے۔

مشرق کے دو اقتباسات پیش کئے ہیں۔ لیکن وہ غالباً شاہ صاحب کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ شاہ صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ ہر نبی کو اس کی اپنی زبان میں وحی ہوتی ہے۔ وہ زبان کے محاورات اور اسالیب بیان سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے، "نتیجۃً" اسے وحی کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اس وقت شاہ صاحب کی کتاب (فیوض الحرمین) تو سامنے نہیں البتہ اقتباس کا وہ انگریزی ترجمہ موجود ہے جو ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

"اور لفظی الہام ان الفاظ، محاورات اور اسالیب کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو پیغمبر کے دماغ میں پہلے ہی موجود ہوتے ہیں"

یعنی جن سے نبی پوری طرح آگاہ ہوتا ہے، کہ ایک نبی پر کسی ایسی زبان میں الہام شروع ہو جائے، جس سے وہ قطعاً ناواقف ہو۔ تو ظاہر ہے کہ وہ نہ اُسے سمجھ سکے گا اور نہ ضبط کر سکے گا۔

رہا اقبال تو اس نے وحی پر کھل کر بات نہیں کی محض اشاروں سے کام لیا ہے، ممکن ہے۔ کہ اقبال کا مفہوم وہی ہو جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے، کہ "خیالات والفاظ پر دو نبی کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کا سرچشمہ نبی سے باہر ہوتا ہے" (ملخص۔ مضمونِ بالا ضمیمۂ مذکورہ ص ۳ کالم ۵)

اگر ہم اس نظریئے کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کی کوشش کریں تو اس سے تین نقصان ہوں گے۔

اول: قرآن کی قدر و منزلت کم ہو جائے گی۔

دوم: مرورِ زمانہ سے ہر عقیدہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اگر آج ہم نے امت سے یہ منوا لیا کہ قرآن کے الفاظ و معانی رسول کے دماغ میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کا سرچشمہ کہیں باہر تھا، تو کچھ عرصے کے بعد لوگوں کو پہلی بات تو یاد رہ جائے گی اور سرچشمہ والی بھول جائے گی۔

سوم: جبریل تو داخلی اور خارجی حقیقت سمجھنے والوں کے دو گروہ بن جائیں گے۔ اور ان میں کفر و اسلام کی خلیجیں حائل ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب اعتزال کے بھی مداح ہیں، کون نہیں جانتا کہ معتزلوں نے اسلام کی بنیادیں ہلا دی تھیں ان میں سے اکثر کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا صرف عقلِ اول کو پیدا کرنے کے بعد صفتِ خلق سے محروم ہو گیا تھا، کچھ ایسے بھی تھے جو فلسفۂ یونان کو تعلیماتِ اسلام پر ترجیح دیتے تھے۔ اور کچھ قرآن کو تصنیفِ رسول سمجھتے تھے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب اعتزال کو ریشنلزم اور معقولیت کا نام دیتے ہیں اور انہیں اس چیز کا افسوس ہے کہ آرتھوڈاکسی (ملائیت) نے اس تحریک کو کچل ڈالا۔ فرماتے ہیں:

"مامون کے دور میں اعتزالی مذہب سلطنت بن گیا تھا لیکن بعد میں آرتھوڈاکسی (ملائیت) نے سیاسی اقتدار اور یونانی طرزِ استدلال سے کام لے کر بالادستی حاصل کر لی اور رفتہ رفتہ نظامِ تعلیم پر قابض ہو کر اُسے اپنے ذہنی و روحانی مقاصد کے مطابق ڈھال لیا۔

.... یہ آرتھوڈاکسی نظامِ تعلیم اس حد تک اثر انداز ہوا کہ ریشنلزم (عقلیت۔ معقولیت) کی تحریک دب گئی۔ البتہ چوتھی سے چھٹی صدی ہجری تک بعض ممتاز فلسفیوں کی انفرادی کوششوں سے ملائی روایات میں قدرے تبدیلی آئی۔ اور آرتھوڈاکسی نے اپنے حلقوں میں معقولیت کو بھی تھوڑی سی جگہ دیدی۔ لیکن ساتھ ہی عقلیت پسند حلقے اور طبعیات کے فروغ کو روک دیا۔"

(ملخص "اسلام" ص ۵)

اس دور کے نصابِ تعلیم کے متعلق جو قرآن، حدیث، قانون، اخلاقیات کے علاوہ ریاضی، ہیئت، فلسفۂ یونان اور طبعیات پر بھی مشتمل تھا، فرماتے ہیں۔

اس نصابِ تعلیم نے جو جامد اور تنگ داماں تھا،

ام میں جمود پیدا کر دیا۔

(اسلام ص ۵)

تصوف کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

علماء کے اس سسٹم فقہ کے ارتقاء اور اس کے مقام اسلام میں ایک نیا تفرقہ اور تناؤ پیدا ہو گیا جو اعتراضاً تھوڈاکسی کے تفرقہ سے زیادہ خطرناک تھا اور وہ تھا ۔ف۔"

(اسلام ص ۶۷)

تصوف کثرتِ عبادت کا نام ہے، خود رسول اور تمام صحابہ اس صفت سے متصف تھے۔ دنیا میں اسلام کی اشاعت ۔یوں کے دم سے ہوئی۔ ہندوستان میں خواجہ اجمیری ۔رید اور داتا گنج بخش کے فیض سے لاکھوں ہندو مسلمان ہوئے تو پھر تصوف خطرناک کیونکر ہوا؟ اگر دو چار ٹھگ ان کر لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیں تو کیا ہم تصوف کے وہ تنظام کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے؟ یا اگر کوئی پھر ادعائے نبوت کر دے تو ہم سلسلۂ نبوت کو موردِ الزام بنائیں گے؟

قصص قرآن

قرآن میں بعض واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا کہ ہم تمہیں غیب کی باتیں بتا رہے ہیں مثلاً قصۂ مسیح و مریم کے بعد کہا:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (عمران - ۴۴)

(یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں)

قصہ یوسف کے بعد بھی یہی آیت دہرا دی۔ اور قصۂ نوح کے بعد فرمایا۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا۔ (ھود — ۴۹)

(ہم تمہیں غیب کی وہ باتیں بتا رہے ہیں جن کو تم اور تمہاری قوم ناواقف تھی)

ان حکایات کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا ارشاد یہ ہے:

"یہ کہانیاں کس حد تک صحیح ہیں۔ اور ان افسانوں سے کتنی ملتی جلتی ہیں جو قبل از اسلام وہاں چل رہے تھے ایک دلچسپ مطالعہ ہے، ان حکایات کی صحت کو ثابت کرنا آسان نہیں۔ .... اگر محمد ﷺ کو یہ کہانیاں تاریخی طور پر پہلے معلوم ہوتیں تو اسے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ وحی کیا کہہ رہی ہے۔"

(ملخص اسلام ص ۱۶)

اس اقتباس سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

اول: کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں حکایاتِ قرآن صحت طلب ہیں، اور ان کے اشتباہ کی یہ کیفیت ہے کہ انھیں "صحیح ثابت کرنا آسان نہیں"

دوم: گو اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ اے رسول تم ان حکایات میں سے بعض کو پہلے نہیں جانتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو اللہ سے اتفاق نہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر "محمد" کو یہ حکایات پہلے معلوم نہ ہوتیں تو اُسے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ وحی کیا کہہ رہی ہے۔ (ص ۱۶)

اس انوکھی دلیل کا خلاصہ یہ کہ صرف وہی حکایت ایک آدمی کی سمجھ میں آ سکتی ہے جو اسے پہلے ہی معلوم ہو۔

اس کتاب میں چالیسویں صفحہ تک یا تو زہریلے مستشرقین کے اقوال ہیں۔ یا ائمہ و اصحاب کے فقہی اختلافات کا ذکر۔ یا احادیث کے ناقابلِ اعتماد ہونے کی داستان۔ یا اسلام کے جمود یا اقلیت کی ناکامی کا ماتم۔ پڑھ کر پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ ہم مسلمان بن کر کوئی جرم کر بیٹھے ہیں۔ اور

● ڈاکٹر صاحب نے حضور صلعم کو ہر مقام پر صرف "محمد" لکھا ہے۔ نہ صلوٰۃ کا ذکر ہے نہ سلام کا۔

ساتھ ہی ذہن سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب کیوں لکھی؟ ہمیں اسلام کی طرف بلانے۔ یا اس سے بددل کرنے کے لئے؟ غالباً ادارہ تحقیقات اسلامیہ[1] کا مقصد تو یہ تھا۔ کہ آپ نئے علمی نظریات اور سائنسی انکشافات سے اسلامی تعلیمات کے لئے ایسے شواہد تلاش کریں، کہ نسل نو جو اضطراب ارتیاب اور تذبذب کا شکار ہے یقین وایمان کی دولت سے مالا مال ہو جائے۔ اس کے سامنے اس کے عظیم اسلاف کے تابدار کارنامے اس انداز سے پیش کریں کہ یہ اپنے ماضی اور اپنی تہذیب پر ناز کرنے لگے۔ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یہ نتائج قطعاً برآمد نہیں ہو سکتے۔

ایک فضا۔ ایک ضمیر

آج دنیا میں ہماری تعداد ستر کروڑ سے زیادہ ہے اور یہ ہمارے علماء کی چودہ سو سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہم سب کا ضمیر ایک ہے، ہماری پسند ناپسند ایک ہے۔ خیر و شر۔ ثواب و عذاب اور عزت و ذلت کا تصور ایک ہی ہماری فضا ایک ہے۔ جہاں خدا، رسول اور قرآن کی سلطانی ہے۔ اگر آج ہم کسی طرح یہ ثابت کردیں کہ قرآن کی حکایات فرضی ہیں یا یہ رسول کی تصنیف ہے، تو پھر نہ ضمیر ایک ہوگا نہ فضا۔ اس کے بعد چین و عرب کو تو جمع کرنا ایک طرف ہم شرقی و غربی پاکستان کو بھی یکجا نہیں رکھ سکیں گے۔

آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) کی وحدت بڑی چیز ہے۔ روس نے اپنی سابق آئیڈیالوجی (مارکس لینن۔ اسٹالن ازم) میں صرف اتنی سی ترمیم کی کہ اسٹالن کو خارج کردیا۔ اور معاً چین کے ۵۰ کروڑ، ہند چینی، کوریا، چیکوسلوواکیہ اور البانیہ کے سات کروڑ کمیونسٹ اس کے جانی دشمن بن گئے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج ہمارے عقائد میں کچھ نہ کچھ افراط و تفریط موجود ہے۔ ہم بعض اوقات اسلام کی پوری تصویر سامنے نہیں رکھتے۔ اور کسی ایک رکن (نماز ... ہی کو پورا اسلام سمجھ کر اس پر سارا زور صرف کردیتے ہیں۔ ... لئے آج کے محقق کا ایک فرض یہ بھی ہے، کہ وہ مذہب ... سے غیر مذہبی چیزوں کو باہر نکالے۔ لیکن بنیادی عقا... پر قطعاً تنقید نہ کرے، کہ یہ کام بڑا ہی خطرناک ہے۔

تجدید یا تجدد؟

مذہب کو آلائشوں سے پاک ... تجدید ہے اور مذہب ... بغاوت تجدد۔ امام احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، ملا ... حضرت سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ مجدد تھے۔ ... میں متجدد بھی پیدا ہوتے رہے۔ اسلام میں یہ دو ... دینی متجددین کی تخلیق تھے۔ یہ لوگ کسی نہ کسی بنیادی عق... یا حکم کی بیخ کنی میں مصروف رہے۔ مروالروذ کا ایک فلـ... ابن راوندی (۹۱۵ء) قرآن کو تصنیف رسول سمجھتا تھا، ... عقیدہ ابو العلا معری (۱۰۵۷ء) کا بھی تھا۔ فارابی (... نبوت کو کسبی سمجھتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ہر شخص محنت اور ریاض... سے نبی بن سکتا ہے۔ عیسیٰ بن صبیح (معتزلی) (۸۴۰... کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ ... رازی (۹۳۲ء) انبیاء کو گناہگار سمجھتا تھا۔ اس نے ا... موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ عنوان: مخاریق الا... اس میں ہر نبی کے "گناہ" شمار کئے ہیں۔

یہ تو تھے ہزار سال پہلے کے متجدد۔ گذشتہ سو برس ... ان کی ایک نئی قسم معرض وجود میں آئی ہے جو اسلام پر ... مغرب کا رنگ چڑھانا چاہتی ہے۔ ان کے بڑے بڑے ... مصر، ترکی اور بیروت ہیں۔ ان میں مشہور یہ ہیں اسماعیل ... (مصر)۔ مذہب کو ترقی کا دشمن اور تعلیم انبیاء کو حکمت و دان... سے خالی سمجھتا ہے۔ خالد محمد خالد "من ہنا نبدأ" کا مصنف ... علی عبدالرزاق "الاسلام و اصول الحکم" کا مصنف، ڈاکٹر ...

---

[1] واضح رہے کہ یہ مضمون ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے ادارہ تحقیقات اسلامی سے علیحدہ ہونے سے پہلے لکھا گیا تھا ۔۔۔۔ مد

مصطفیٰ المراغی بھی مصر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترکی میں اس کا علم بردار ضیا گوک الپ تھا، انڈونیشیا میں حاجی سلیم۔ ہندوستان میں آصف فیضی ماڈرن اپروچ ٹو اسلام کا مصنف اور پاکستان میں علامہ نیاز جو قرآن کو محض کلام رسول سمجھتا تھا۔

ہمیں ان متجددین کی ضرورت نہیں، بلکہ ایسے اہل قلم کی ضرورت ہے جو مستشرقین کے حملوں کو روکیں اور مسلمانوں کو تہذیب نو کے مفاسد سے بچائیں۔ تعلیمات اسلام کے لئے علم جدید سے شواہد فراہم کریں اور دنیا پر یہ واضح کریں کہ اسلام ہی امن عالم کا کفیل۔ فلاح انسانی کا ضامن اور اطمینان و سکون کا راستہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی بلند علمی صلاحیتیں فروغ اسلام میں صرف ہوں گی اور وہ تجدد کی پُرخار وادی میں داخل نہیں ہوں گے۔

آپ جانتے ہیں کہ دیگر تمام ادیان مٹ چکے ہیں، ان کی تعلیم موجود نہ عمل باقی۔ لے دے کے صرف ایک کتاب اور ایک امت باقی رہ گئی ہے۔ یعنی قرآن اور مسلمان۔ اگر مسلمان بھی رہ راست سے بھٹک گیا، تو پھر دنیا کے لئے کوئی امید باقی نہیں رہے گی، اس کے بعد پٹے گی۔ اور پٹتے ہی پٹتے فنا ہو جائے گی۔

اللہ نوع انسان کو اس انجام سے محفوظ رکھے۔

سب سے پہلے

(مرسلہ اعجاز احمد خاں سنگھانوی)

(۱) سب سے پہلے کتب خانہ اسلام کی تاریخ میں بنی امیہ کے ایک فرد خالد بن یزید بن معاویہؓ نے قائم کیا۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ص ۳۴ مئی ۱۹۵۶ء)

(۲) اسلام کے سب سے پہلے موذن حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ ہیں۔

(۳) اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں سب سے پہلا خون حضرت حارث بن ابی ہالہ رضؓ کا تھا۔ (اسوۂ حسنہ ص)

(۴) اسلام میں سب سے پہلی شہادت حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی ہوئی۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فدویت اور جاں نثاری میں سب سے پہلی تلوار ایک بچے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے برہنہ ہوئی۔

(۶) اسلام کی سب سے پہلی غنیمت جو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے وصول فرمائی۔

(۷) کفار کا پہلا مقتول عمرو بن حضرمی تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

(۸) عہد صدیقی میں منافقین اور مرتدین کی شورش و بغاوت کے خلاف پہلی تلوار جس کی نیام سے باہر ہوئی وہ حضرت معاویہؓ کے چچا حضرت خالد بن سعید اموی رضی اللہ عنہ تھے۔

(حضرت معاویہ بن ابی سفیان ص ۱۳)

(۹) اسلام میں بحری بیڑے کے سب سے پہلے موجد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ (ایضاً ص ۱۹)

(۱۰) مساجد کے مینار سب سے پہلے حضرت معاویہؓ کے عہد میں حضرت مسلمہ بن مخلدؓ نے ۵۳ھ میں بنوائے۔ (ایضاً ص ۲۶)

چوتھی قسط

محمد تقی عثمانی

عیسائیت کا بانی کون ہے؟

۲۔ تاریخی شواہد

مذکورہ بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پولس کے نظریات میں کس قدر تضاد ہے، اور موجودہ عیسائی مذہب کے بنیادی عقائد و احکام حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم نہیں ہیں۔ بلکہ انہیں پولس نے وضع کیا ہے۔ تثلیث، حلول و تجسم، کفارہ، تورات کی پابندی عشاء ربانی اور نسخ ختنہ کے تمام نظریات کا بانی وہی ہے۔

اگر صرف انہی شواہد کی بنیاد پر یہ کہا جائے کہ پولس ہی موجودہ عیسائیت کا بانی ہے، تو ہماری نگاہ میں یہ بات عین قرین انصاف ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ تاریخی شواہد بھی پیش کر دیئے جائیں جن کی روشنی میں یہ دعویٰ مزید واضح ہو جاتا ہے اس کے لئے ہمیں پولس کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اگرچہ پولس کی سوانح حیات پر مستند مواد محدود ہے، تاہم کتاب اعمال خود پولس کے خطوط اور ان پر مبنی وہ کتابیں جو عیسائی علماء نے لکھی ہیں۔ اس دعوے کے بہت سے ثبوت مہیا کرتی ہیں جنہیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں

۱۔ عرب کا سفر

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ پولس شروع میں یہودی تھا، بعد میں اس نے یسوع مسیح (علیہ السلام) پر ایمان لانے کا دعوےٰ کیا تھا، اگر وہ واقعتاً حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات پر ایمان لایا تھا تو صداقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے اس نظریاتی انقلاب کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں اور حواریوں کے پاس گذارتا جنھوں نے براہ راست حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فیض حاصل کیا تھا اور جو اُس وقت دین عیسوی کے سب سے بڑے عالم تھے۔

لیکن پولس کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نظریاتی انقلاب کے فوراً بعد حواریوں کے پاس یروشلم نہیں گیا، بلکہ دمشق کے جنوبی علاقے میں چلا گیا۔ گلتیوں کے نام خط میں وہ خود لکھتا ہے:

> "جس خدا نے مجھے میری ماں کے پیٹ میں سے مخصوص کر لیا اور اپنے فضل سے بلا لیا جب اس کی یہ مرضی ہوئی کہ اپنے بیٹے کو مجھ میں ظاہر کرے تاکہ میں غیر قوموں میں اس کی خوشخبری دوں تو نہ میں نے گوشت اور خون سے صلاح لی، اور نہ یروشلم میں ان کے پاس گیا جو مجھ سے پہلے رسول تھے بلکہ فوراً عرب[1] چلا گیا، پھر وہاں سے دمشق کو

[1] واضح رہے کہ یہاں عرب سے مراد دمشق کا جنوبی علاقہ ہے جو اس زمانہ میں توسعاً عرب کہلاتا تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۳۸۹ ج ۲ مقالہ

واپس آیا" (گلیتوں ۱: ۱۵ تا ۱۷)

عرب جانے کی وجہ کیا تھی؟ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کی زبانی سنئے:

"جلد ہی اسے (یعنی پولس کو) اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اسے ایسی خاموش اور پرسکون فضا میں رہنا چاہئے جہاں وہ اپنی نئی پوزیشن کے بارے میں کچھ سوچ سکے، چنانچہ وہ دمشق کے جنوبی علاقے میں کسی مقام پر چلا گیا ...... اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنے نئے تجربے کی روشنی میں شریعت کے مقام کی نئی تعبیر کرے[1]۔"

اور مشہور عیسائی مورخ جیمس میک کنن اپنی فاضلانہ کتاب "مسیح سے قسطنطین تک" میں لکھتے ہیں:

"اپنے نظریاتی انقلاب کے بعد..... وہ عرب (نبطیریہ) چلا گیا جس کا مقصد بظاہر تبلیغ سے زیادہ یہ تھا کہ اپنے نئے عقیدہ کے مقتضیات پر غور کرے۔ اس کے تین سال بعد وہ یروشلم گیا تاکہ یسوع مسیح کے بارے میں جو روایت تھی اس کے بارے میں مشورہ کرنے کے لئے پطرس اور خداوند کے بھائی یعقوب سے ملاقات کرے[2]۔"

سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ایمان لانے کے بعد اس نے تین سال کا طویل عرصہ الگ تھلگ رہ کر کیوں گذارا؟ اور ان لوگوں سے اس دین کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جنھوں نے براہ راست حضرت مسیح علیہ السلام سے فیض اٹھایا تھا؟ ——— کیا اس کا صاف جواب اوپر کے دو اقتباسات میں یہ نہیں دیا گیا کہ دراصل وہ اپنی اس تبدیلی کے بعد وہ مذہب اور وہ تعلیمات اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا جنھیں اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دین عیسوی قرار دیتے آئے تھے، بلکہ وہ "شریعت" اور دین عیسوی کی (بقول برٹانیکا) "نئی تعبیر کرنا چاہتا تھا" اور اس مقصد کے لئے اسے خاموش اور پرسکون فضا میں غور و فکر کرنے کی ضرورت تھی، اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی دین کے بجائے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنی تھی جس کے لئے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسم گرامی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ پولس کے ایک مشہور عیسائی سوانح نگار ایف۔ جے فوکس جیکسن[3] پولس کے اس عمل کی تاویل اس طرح کرتے ہیں:

پولس کو اس بات کا یقین تھا کہ خدا نے اسے کام کا ایک مخصوص میدان دیا ہے۔ اور کسی ثانی شخص کو اس کے معاملات میں اس وقت تک دخل اندازی نہ کرنی چاہئے جب تک کہ خدا کی روح خود اس کی رہنمائی ہوئی ہے۔ اگر یہ یہ بات ذہن میں رہے تو پولس کے اس طرز عمل کو سمجھنے میں مدد ملے گی کہ اس نے زندہ یسوع مسیح کو سمجھنے کے لئے پیشرو حواریوں سے تعلیم حاصل نہیں کی، اور اس سلسلے میں ان کا ممنون ہونے کے بجائے براہ راست خداوند سے رابطہ قائم رکھا[4]۔"

لیکن ذرا غور فرمائیے کہ یہ بات کتنی غیر معقول ہے؟ آخر

---

[1] برٹانیکا بحوالۂ مذکورہ [2] Mackinon, James, *from Christ to Constantine*, London, Longmans green 1936 P. 91

[3] F. J. Foakes Jackson, *Life of St. Paul*, London 1933 P 129

[4] یہاں مسٹر ... پولس کی عبارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو خوشخبری میں نے سنائی وہ انسان کی سی نہیں کیونکہ وہ مجھے انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اس کا مکاشفہ ہوا" (گلیتوں ۱: ۱۱، ۱۲)

اس کی دلیل کیا ہے کہ پولس آن کی آن میں تقدس اور رسالت کے اس مقام بلند تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے کسی حواری کی تعلیم کی ضرورت نہیں رہتی؟ اگر اس غیر معمولی طریقے سے وہ بعینہ ان تعلیمات کا اعلان کرتا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حواریوں اور ان کی انجیل کے ذریعے ثابت ہیں، تب بھی بات کسی درجہ میں معقول ہو سکتی تھی، لیکن آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ وہ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بتلائے ہوئے عقائد وتصورات سے بالکل متضاد نظریات بیان کرتا ہے، ایسی صورت میں اس کی کوئی دلیل تو ہونی چاہئے کہ اسے براہ راست خدا کی طرف سے ان عقائد کی تعلیم دی گئی ہے، اور اس تعلیم کے بعد دین عیسوی کی سابقہ تعبیر منسوخ ہو چکی ہے، جب ایسی کوئی دلیل آج تک کوئی پیش نہیں کر سکا تو کیا یہ نرا دعوے اس لائق ہے کہ اس کی بنا پر دین عیسوی کی بالکل کایا پلٹ دی جائے؟

پھر اگر حضرت عیسیٰؑ کے فوراً بعد انہی کی مرضی سے ایک ایسا "انقلابی رسول" آنے والا تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی آمد کے بارے میں کوئی ہدایت کیوں نہیں دی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ نے (بقول نصاریٰ) عید پنتی کوسٹ کے موقعہ پر نزول روح القدس[1] کی خبر دی تھی حالانکہ وہ کوئی انقلابی واقعہ نہ تھا، مگر پولس کے رسول بن کر آنے کی کوئی خبر آپؑ نے نہیں دی۔

پولس کے ساتھ حواریوں کا طرز عمل

اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر پولس کا یہ دعویٰ غلط تھا اور وہ دین عیسوی کی پیروی کرنے کے بجائے اس کی تحریف کر رہا تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اس کے ساتھ تعاون کیوں کیا؟

اس سوال کے جواب کے لئے قدرے تفصیل کی ضرورت ہے، ہماری تحقیق یہ ہے کہ پولس نے حواریوں کے سامنے آتے ہی فوراً اپنے انقلابی نظریات پیش نہیں کئے تھے، بلکہ وہ شروع میں دین عیسوی کے ایک سچے پیرو کی شکل میں ان کے سامنے آیا تھا اس لئے حواریوں نے اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا، لیکن جب رفتہ رفتہ اس نے عیسوی عقائد میں ترمیم شروع کی اور اس کے بنیادی تصورات پر ضربیں لگائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اس سے اختلاف کر کے قطعی طور پر الگ ہو گئے۔

افسوس یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس اس زمانے کے حالات معلوم کرنے کے صرف دو ذریعے ہیں، ایک خود پولس کے خطوط، دوسرے اس کے شاگرد لوقا کی کتاب اعمال، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں پولسی اثرات کے حامل ہونے کی وجہ سے تحقیق حال کے لئے بہت مخدوش ہیں، تاہم ان دونوں ذرائع سے اور بعض دوسرے تاریخی شواہد سے یہ پتہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ آخر میں پولس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے درمیان شدید اور سنگین اختلافات رونما ہو گئے تھے۔

چونکہ اس پہلو سے اس سے قبل بہت کم غور کیا گیا ہے، اس لئے ہم یہاں مختلف حواریوں کے ساتھ پولس کے تعلقات کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیں گے، تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آ سکے۔

بقیہ مضمون خلائی دوڑ

مذہب مقبول میں نہیں ہے، بلکہ ہم اس وقت یہ کہیں گے کہ جو نظریہ قرآن وسنت کے خلاف ہے اس میں ہی کوئی خلل ہے کیونکہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

---

[1] مقابلہ کیجئے کتاب اعمال باب ۲، اور اعمال ۲:۱

مولانا احمد اللہ صاحب

خلائی دور اور اسلام

خلاء و فضاء اور اجرام سماویہ کی سائنٹفک تحقیقات
لام میں کیا درجہ رکھتی ہیں؟ اس معاملے میں ہمارے یہاں
ی حد تک افراط و تفریط پائی جاتی ہے، بعض ناواقف
ے یہ سمجھتے ہیں کہ آج اس سلسلے میں سائنس جتنی تحقیقات
رہی ہے وہ سب خلاف اسلام ہیں۔ اور دوسری طرف
ض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ تحقیقات قرآن کریم کی
ن دعوت ہیں، اور جتنی آیات میں کائنات پر غور و فکر
رنے کا حکم ہے ان سب میں اسی قسم کی تحقیقات کی طرف
عوت دی گئی ہے حالانکہ یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں،
نہ یہ کہنا درست ہے کہ اسلام ان تحقیقات کا مخالف
ہے، اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ قرآن کی آیات کو ان کا یہی
مقصد ہے۔

کائنات عالم میں گھٹنے بڑھنے کا نظام عجیب و غریب
ہے جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ
کا فرق نہیں آتا۔ ان سب امور سے ایک ادنیٰ بصیرت
رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب
کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا ہے، کوئی اسکو
چلانے بنانے والا باقی رکھنے والا یقیناً موجود ہے۔ اور اتنا
سمجھنے کے لئے انسان کو کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ
وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ قرآن نے اس کی طرف
دعوت دی ہے، قرآن کی دعوت صرف اس حد تک ان
چیزوں میں غور و فکر کرنے کی ہے جو عام مشاہدے اور
تجربے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم سید
ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رض نے اجرام سماوی
کی ہیئتیں دریافت کرنے کا مطلقاً اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر
اُن آیات کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا یہ مطلب ہوتا کہ
ان کی حقائق اور ہیئات اور ان کی حرکات کا فلسفہ اور
ان کی حقیقت کا انکشاف کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اہتمام اور اس کی طرف توجہ
نہ فرماتے خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم و تعلم اس
وقت دنیا میں موجود بھی تھا۔ مصر، شام، عرب، ہند
چین وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام
کرنے والے کافی حد تک موجود تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام
سے پانچسو سال پہلے فیثا غورس کا اور اس کے کچھ بعد
بطلیموس کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا اور
اس زمانے کے حالات کے مناسب آلات رصدیہ وغیرہ ایجاد
بھی ہو چکے تھے مگر جس ذات قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں
اور جن صحابہ کرام نے بلا واسطہ آپ سے ان کو پڑھا انھوں نے

بھی اس طرف التفات نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا۔ کہ ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور و فکر کا وہ منشا، ہرگز نہ تھا جو آجکل بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اور روس کے معاملات اور نئی نئی ایجادات سے مرعوب و متاثر ہو کر اختیار کیا ہے کہ یہ خلائی سفر چاند اور مریخ و زہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرتا ہے، بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ ان سے بحث کرتا ہے اور نہ ان کی مخالفت کرتا ہے، قرآن کریم کا حکیمانہ اصول و اسلوب کائنات و مخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اسی قدر لینا اور بیان کرتا ہے، جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل کر سکتا ہے اور جن کے حصول پر تخمیناً اس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے فلسفیانہ دور از کار بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں۔ اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزل مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات و مخلوقات سے آگے اپنے خالق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے، حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے، اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے ہر زمانہ کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے نئے انکشافات اس کی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جا سکتا اس لئے قرآن حکیم ان فلسفی باریکیوں اور دور از کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا بلکہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت پائی جاتی ہے

علماء اہل حق قدیم و جدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل کے متعلق جو بات قرآن کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اس سے مختلف ہو تو اس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں بلکہ اس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ سائنس ابھی اپنی کم علمی اور تحقیق کی خامی کی بناء پر اصل حقیقت تک نہیں پہنچی۔ جوں جوں انسان کی سائنسی معلومات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ قرآن و سنت کے بیان کئے ہوئے حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے، البتہ واقعہ یہی ہے کہ اب تک ہیئت جدید نے جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں ان میں جہاں تک اہل تحقیق علماء نے غور و فکر کیا ہے۔ آسمانوں کے انکار کے سوا کوئی بھی قرآن و سنت کے اصولوں کے خلاف نہیں لیکن بعض لوگ اپنے قصور علم سے ان کو قرآن و سنت کے خلاف سمجھ کر قسم بقسم بیجا تاویلات رکیکہ کے درپے ہوتے ہیں بلکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے بھی کل ستارے اور سیارے شمس و قمر، مریخ، زہرہ وغیرہ سب فضاء میں معلق ہیں یعنی بین السماء والارض ہیں۔ آسمانوں میں ایک بھی ستارہ نہیں، جیسے ابن عباس رضہ سے تفسیر روح المعانی ص ۵۱ ج ۳ سورۂ تکویر کی تفسیر میں روایت ہے۔

النجوم قناديل معلقة بين السماء والارض
بسلاسل من نور بايدي الملائكة
ويقرب منه قول الفلاسفة الجديدة
لكن بالجذب۔

(ترجمہ) کل ستارے آسمان و زمین کے درمیان فضا میں نور کی زنجیروں سے لٹکائے ہوئے فانوس کی طرح ہیں ان کی باگ ڈور فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور جدید فلاسفروں کے قول اس کے قریب قریب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جدید فلاسفر سب ستاروں کو ان کی آپس کی جذب

وکشش سے معلق مانتے ہیں۔

اسی طرح عطاء بن رباح استاد امام ابوحنیفہ کا بھی قول ہے اور زمانہ حال کے سب سے بڑے مفسر قرآن سید محمود آلوسی بغدادی جن کی تفسیر روح المعانی علماء سلف کی تفاسیر کا بہترین خلاصہ اور عرب وعجم مشرق ومغرب میں مقبول ومستند تفسیر ہے موصوف جس طرح قرآن و سنت کے متبحر عالم تھے اسی طرح فلسفہ وہیئت قدیم وجدید کے بھی بڑے عالم تھے وہ بھی اپنی تفسیر میں سورۂ طلاق کی آیت ومن الارض مثلهن کے تحت بھی رقمطراز ہیں

ولا يقوم دليل على ان شيئاً من الكواكب مغروز في شئ من السموات كالفص في الخاتم والمسمار في اللوح۔

(ترجمہ: اس بات پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے کہ ستارے آسمان میں اس طرح گڑے ہوئے ہیں جس طرح نگینہ انگشتری میں اور کیل لکڑی میں گڑی ہوتی ہے۔ جو پہلے بطلیموسی نظریہ تھا)

اسی جگہ علامہ آلوسی اسرائیلی روایات کی تردید بھی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نعم اكثر الاخبار في امر السموات والارض لا يعول عليها اشار اليه النسفي في بحر الكلام۔

(ترجمہ: یعنی علامہ آلوسی اسی جگہ امام نسفی کی کتاب بحر الکلام حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آسمان وزمین کے متعلق بیشتر روایات غیر معتمد ہیں۔)

باقی جن آیات سے ستاروں کا آسمان میں ہونا مترشح ہوتا ہے اس کی تردید تفسیر روح المعانی کی جلد ۱۷ - ص ۱ - ۳۰ میں بڑی بسط وتفصیل کے ساتھ موجود ہے ملاحظہ فرمائیں

متعدد تفسیروں سے ہم اس کی طرف کچھ روشنی ڈالتے ہیں تفسیر کبیر، ابن کثیر، روح المعانی، تفسیر خازن، درمنثور ودیگر کتب تفسیر میں سورۂ انبیاء کی آیت۔ كل في فلك يسبحون (آفتاب ومہتاب ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں تیر رہے ہیں) کے تحت لکھتے ہیں۔

قال اكثر المفسرين الفلك هو موج مكفوف تحت السماء تجري فيه الشمس والقمر وقال الضحاك هو ليس بجسم بل مدار هذه النجوم

(ترجمہ: مذکورہ آیت کریمہ میں لفظ فلک کے متعلق جمہور مفسرین کا قول ہے۔ کہ فلک سے مراد آسمان کے نیچے بشکل دائرہ ایک خلائی موج ہے۔ جس میں چاند سورج چکر کاٹتے ہیں۔

امام تفسیر ضحاک فرماتے ہیں کہ فلک کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ ان ستاروں کے مدار کو کہتے ہیں۔ اور تفسیر ابن عباس میں سورۂ یٰسین کی آیت مذکورہ کے تحت لکھتے ہیں۔

في دوران يدورون وفي مجراه يجرون

(ترجمہ: شمس وقمر ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں گردش کرتے ہیں اور اپنے مداروں میں چکر لگاتے ہیں)

اور تفسیر معالم التنزیل للبغوی میں كل في فلك يسبحون کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

يسبحون اي يجرون ويسيرون بسرعة كالسابح في الماء والفلك مدار النجوم الذي يضمها وهو في كلام العرب كل شئ مستدير وجمعه افلاك۔

(ترجمہ: تفسیر معالم التنزیل میں ہے۔ کہ آیت کریمہ میں

یسبحون کی تفسیر یہ ہے کہ چاند و سورج ایسی تیز رفتاری سے چلتے ہیں کہ جیسے پانی میں تیراک۔ اور فلک ستاروں کے اس مدار کو کہتے ہیں جو ان پر محیط ہے، دراصل کلام عرب میں ہر مدور چیز کو فلک کہتے ہیں اس کی جمع عربی میں افلاک کہتے ہیں

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آیت مذکورہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں (اور دونوں ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں) دوسری آیت، قولہ تعالیٰ

تبارک الذی جعل فی السماء بروجا

(ترجمہ: بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں ستاروں کے لئے راستے بنائے)

(پہلی توجیہ) آیت کریمہ میں اگر بروج سے ستارے یا ان کے چلنے کے راستے مراد لئے جائیں جیسے عام مفسرین لکھتے ہیں اس وقت لفظ سماء سے فضائے آسمان مراد ہے نہ کہ آسمان شرعی اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ لفظ سماء کے احد المعنیین کی تعیین کرنا ہے۔ کیونکہ کلام عرب میں بلکہ خود قرآن مجید کے بہت سے مواضع میں لفظ سماء کا اطلاق ہر بلند چیز پر آیا ہے

کما یقال فی کلام العرب کل ما علاک فھو سماء۔

(ترجمہ: جو تمہارے اوپر ہے وہ آسمان ہے)

وفی قول الشاعر ؏

اذا انزل السماء بارض قوم۔ ای المطر

(یعنی شاعر کے اس کلام میں بارش پر لفظ سماء استعمال کیا گیا ہے)

وقولہ تعالیٰ فلیمدد بسبب الی السماء (سورۃ حج) ای السقف باتفاق المفسرین۔

(ترجمہ: پس چاہئے کہ چھت کے ساتھ ایک رسی تان لے)

وقولہ تعالیٰ۔ وانزلنا من السماء ماءً طھورا (ای السحاب)

(ترجمہ: اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بادل سے پاکیزہ پانی اتارا۔)

دوسری توجیہ۔ یا آیت کریمہ میں فی السماء سے قرب آسمان مراد ہے اور قرب شئی پر شئی کا حکم دیا جاتا ہے اس کے نظائر احادیث و قرآن و کلام عرب میں جگہ بجگہ ملتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر بیان القرآن میں اس آیت کے تحت یہی توجیہ لکھی ہے۔

تیسری توجیہ۔ یا آیت مذکورہ میں بروج کا معنی قصور ہے یعنی کوٹھریاں۔ یعنی آسمان میں جس طرح دروازے ہیں اسی طرح ان میں کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں جن میں فرشتے بیٹھ کر پہرہ دیتے ہیں۔ اور بحکم الٰہی شیطانوں پر شہاب ثاقب پھینکتے ہیں۔ تفسیر ابن عباس، درمنثور، ابن کثیر وغیرہ میں یہ تفسیر بھی لکھی ہے۔

کما فی آیۃ اخریٰ ولو کنتم فی بروج ای قصور مشیدۃ

(ترجمہ: اگر تم بلند و مضبوط بلڈنگ کی کوٹھریوں میں پناہ گزیں ہو جاؤ موت وہاں بھی تمکو پالے گی)

تیسری آیت۔ قولہ تعالیٰ۔ وجعل القمر فیھن نوراً

(ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے چاند کو آسمانوں میں نور بنایا)

یہاں لفظ فیھن کا تعلق جعل کے ساتھ کرنے سے ایک قسم کا شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید چاند آسمان کے ثخن میں پیوست ہے لیکن اگر اس کو اس کے مابعد نوراً کے ساتھ متعلق کیا جائے تو شبہ کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے اور ظرف کی تقدیم و تاخیر کلام عرب میں بلکہ خود قرآن مجید میں بکثرت موجود ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ شمس و قمر آسمان کے نیچے فضاء میں رہتے ہوئے بھی آسمانوں کے لئے نور و چراغ ہیں اس کی تائید اس سے ملتی ہے کہ اس آیت کے تحت تفسیر کبیر، درمنثور، بحر محیط، خازن وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ چاند و سورج کے چہرے آسمانوں کی طرف ہیں اور ان کی پشت زمین کی طرف ہے اس سے واضح ہو گیا کہ شمس و قمر کے چہرے اور روشنی آسمانوں کی طرف زیادہ ہونے کی

وجہ سے ان کو وہاں کا نور و چراغ فرمایا گیا ہے: اس وجہ سے کہ وہ جسم آسمان میں گڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ توجیہ بالکل آسمان اور بے غبار ہے کہ چونکہ یہ ستارے اور سیارے سب زمین کی بہ نسبت آسمان کے قریب ہیں اس لئے قرآن مجید میں ان کو کہیں آسمان کا نور و چراغ اور کہیں آسمان کی زینت سے تعبیر کی گئی ہے۔

ماقبل کی ان تصریحات سے واضح ہوگیا کہ اکثر مفسرین اسلام محل کواکب کو (جس میں شمس و قمر وغیرہ گردش کرتے ہیں) تحت السماء تسلیم کرتے ہیں نہ کہ فی السماء یعنی آسمان کے نیچے نہ کہ آسمان میں اور جبکہ قرآن کریم کی آیت مذکورہ کل فی فلک یسبحون سے ستاروں کے بذات خود حرکت کرتا ثابت ہوا اس سے علم الافلاک کے متعلق بطلیموسی نظریہ غلط ثابت ہوا جس کی رو سے ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں اور وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ ان کی حرکت آسمان کی حرکت کے تابع ہوتی ہے۔ اسی طرح فیثاغورث کے اصل نظریہ میں جو آفتاب کو ساکن قرار دیا گیا تھا اور یوروپ کے ماہرین بھی صدیوں تک یہی کہتے رہے یہ امر قرآن کریم کی اس تصریح کے خلاف ہے جو سورہ یٰسین میں موجود ہے (والشمس تجری لمستقر لها) ترجمہ (اور آفتاب اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے) جس سے آفتاب کا بھی حرکت کرنا ثابت ہوتا ہے، اس لئے ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ جس طرح آج کے تجربات نے بطلیموسی نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے آفتاب کے ساکن ہونیکا نظریہ بھی یقیناً غلط ہوگا۔ ممکن ہے کہ آئندہ تحقیقات اسکے غلط ہونے کا بھی ثبوت بہم پہنچاویں۔ چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی اور تیرھویں صدی ہجری ہیئت جدیدکے ماہرین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ آفتاب خود اپنے محور پر حرکت کرتا ہے اور بعد کی تحقیقات نے اس کو بھی تسلیم کر لیا کہ آفتاب اپنے محور کی حرکت کے علاوہ پورے نظام شمسی کے ساتھ ثریا کے کسی ستارے کے گرد حرکت کرتا ہے اور اس کا بھی امکان تسلیم کیا گیا کہ پھر وہ سیارہ اس سیاراتی نظام کے ساتھ کسی اور ستارہ کے گرد حرکت کرتا ہے کیونکہ نہ اس فضائے آسمان کی کوئی حد و انتہا نظر آتی ہے اور نہ ستاروں کی تعداد شمار کی جاسکتی ہے۔ نیز بعض سائنس دانوں کا جو یہ خیال ہے کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں ہے، ان سائنس دانوں کی یہ رائے بھی قطعی غلط ہے۔ کیونکہ قرآن و سنت کی تصریح کے مطابق آسمان موجود ہے مگر سائنس اپنی کم علمی کی بناء پر اسے دریافت نہیں کر سکی اور اگر انسان کی سائنسی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا تو عین ممکن ہے کہ سائنس دانوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو جائے اور اس کا اعتراف کرے اور وہ اسی طرح آسمان کے وجود کو بھی تسلیم کر لیں جس طرح انہوں نے بعد میں آفتاب کی حرکت اور بہت سی ان چیزوں کو تسلیم کیا ہے جن کا پہلے انکار کیا جاتا تھا۔ ستارے اور سیاروں کے محل وجود کے بارے میں چونکہ بطلیموسی نظریہ عرصہ قدیم سے رائج تھا اور حکومت وقت کی معاونت سے اس کا چرچا اور نشر و اشاعت اطراف عالم میں پھیلی ہوئی تھی اور اب تک اکثر علماء و فضلاء کے دل و دماغ میں وہی بطلیموسی ہیئت چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے تفسیر قرآن لکھنے والے بعض مصنفین نے قرآنی آیات کو بھی اسی نظریہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور جہاں کہیں اس کے خلاف کوئی چیز قرآنی نصوص میں دیکھی بعض نے اس کی تاویلیں شروع کیں مگر ایسے کرنے والے لوگ خال خال ہیں اور جمہور مفسرین نے ایسے وقت میں بھی قرآنی آیات میں تاویل کو جائز نہیں سمجھا۔ پس اگر ہمارے متقدمین کی کسی تفسیر یا ترجمہ میں ستارے وغیرہ کے آسمان میں ہونیکے متعلق کوئی عبارت یا ترجمہ مل جائے تو اس کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ لفظ سماء جس طرح جرم سماء کے لئے اطلاق کیا جاتا ہے اسی طرح بعض اوقات مطلقاً ما فوق الراس کے معنی میں بھی[1] بولا جاتا ہے۔ ان حضرات نے اس دوسرے معنی کے لحاظ

---

[1] جیسے دلیل کے ساتھ ہم نے اس کو ثابت کیا ہے ۱۲

سیارات کو داخل سما، لکھا ہے، کیونکہ اس وقت ہیئت جدیدہ کے خلائی کارنامے کی کامیابیوں نے تجربے اور مشاہدے سے بطلیموسی نظریہ کے پرخچے اڑا دیئے اور فیثاغورسی نظریے کو صحیح ثابت کر دیا لیکن قرآن و سنت میں کسی جگہ نہ بطلیموسی نظریہ کا اثبات ہے اور نہ فیثاغورسی نظریہ کا ابطال اس لئے از روئے قرآن جو بھی تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہو جائے اس کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ (فیثاغورس کا نظریہ تھا کہ زمین اپنے محور پر مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتی ہے، اور چاند وغیرہ کا طلوع جو مشرق کی طرف دیکھا جاتا ہے یہ زمین کی اپنی حرکت کے اعتبار سے ہے۔ اسی پر دن و رات اور مہینو کے شروع اور ختم کا مدار ہے۔ اور یہ کواکب و سیارے سب فضا میں ایک دوسرے کے گرد چکر لگا رہے ہیں)

مشاہدہ قطعیہ کے مقابلہ میں ضعیف روایت تو کیا صحیح روایت کی تاویل بھی لازمی ہے۔

کان العقل الصحیح والنقل الصریح لا یتعارضان اذ لا تعارض بین الصادقین

(ترجمہ: صحیح عقل اور صریح نقل یعنی صحیح طور پر جو نکلنا لوجی امور ثابت ہیں ان کے اور صریح حکم شرعی کے درمیان کوئی اختلاف اور تعارض نہیں کیونکہ دونوں مطابق للواقع ہیں اور دو حق امر کے درمیان کبھی اختلاف و تعارض نہیں ہوتا)

حالانکہ یہاں کسی نص کی تاویل کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی حال میں روسی اور امریکی سائنس دانوں نے چاند پر خلائی جہاز پہنچا دیا جس کو موافق اور مخالف اہل فن سب نے تسلیم کر لیا اور زہرہ پر پہنچانے کی بھی خبریں آ رہی ہیں اس لئے ان مشاہدے اور تجربے سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کواکب و سیارے آسمان کے نیچے فضا میں ہیں کوئی بھی آسمانوں میں پیوست نہیں ہے (جیسے قدیم بطلیموسی ہیئت والوں کا نظریہ تھا) کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ و صریحہ کی تصریحات کی رو سے آسمان ایک ایسا حصار ہے جس میں دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے ان میں ہر شخص داخل نہیں ہو سکتا اس سے معلوم ہوا کہ سات آسمان جن کا ذکر و تفصیل قرآن و سنت میں موجود ہے وہ ان کواکب و سیارات کی فضا سے بہت اونچے اور بلند ہیں۔ جن تک ان راکٹوں اور ہوائی جہازوں کی رسائی ناممکن ہے۔ ورنہ آیات صریحہ و احادیث صحیحہ کی تغلیط لازم آئے گی۔ ماقبل کی تحریرات سے واضح ہو گیا کہ روس اور امریکہ کے خلائی تجربات سے اسلامی تعلیمات پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا۔ اس کا اثر اگر کچھ پڑ بھی تو یونانی علم الافلاک اور ہیئت بطلیموسی پر پڑ سکتا ہے۔ اب تک تو چاند و زہرہ پر پہنچنے کی سعی ہے لیکن اگر تمام کواکب تک بھی رسائی ہو جو مستبعد ہے تو بھی اسلامی تحقیق پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ تاہم اگر ان سب ستاروں تک رسائی ہو جائے تو بھی آسمان تک رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ آسمان تو اس سے بہت اونچے اور وراء الوراء ہیں۔ آخر میں صاحب روح المعانی کے پوتے علامہ سید محمود شکری آلوسی کی ایک عبارت پر مضمون ختم کرتا ہوں۔

رأیت کثیراً من قواعدھا لا یعادی النصوص الواردۃ فی الکتاب والسنۃ علی انھا لو خالفتہ شیئاً من ذالک لم یلتفت الیھا ولم تؤول النصوص لاجلھا والتاویل فیھا لیس من مذاھب السلف الحریۃ بالقبول بل لابد ان نقول ان المخالف مشتمل علی خلل فیہ فان العقل الصریح لا یخالف النقل الصحیح بل کل منھما یصدق الآخر ویؤیدہ۔ مادل علیہ القرآن۔

(ترجمہ: میں نے ہیئت جدیدہ کے بہت سے قواعد کو دیکھا ہے وہ قرآن و سنت کی نصوص کے خلاف نہیں ہیں اور اس کے باوجود اگر وہ قرآن و سنت کی کسی نص کے خلاف ہو تو اس کی طرف رخ نہ کریں گے اور قرآن و سنت کی نصوص میں اس کی وجہ سے تاویل نہ کریں گے کیونکہ ایسی تاویل سلف صالحین کے

(بقیہ پر صفحہ)

مولانا قاضی عبد الصمد سربازی

احیاءِ دینِ اسلام در ترکی

(البلاغ جمادی الاولیٰ ۸۸ھ کے اداریے کو دیکھ کر ایک تأثر)

خوش نویدِ جاں فزا از رحمتِ پروردگار
باز در ترکی بگشتہ دینِ اسلام آشکار

باز خواں ایں قصہ را در ذکر و فکر "البلاغ"
مژدۂ بس روح پرور جانِ من بادا نثار

نشأۃِ ثانی بہ اسلام آمدہ در عصرِ نو
رازہا مخفی است در ہر گردشِ لیل و نہار

یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور
نیست مایوسی ز درگاہِ کریم و کردگار

"سامِ کوہن" زیں خبر ناشاد و غمگیں و حزیں
نعل در آتش فتادہ آں یہودِ نابکار

در زوالِ افتادہ بود اسلام در عہدِ کمال"
غلبۂ الحاد در ہر قریہ و شہر و دیار

فتنۂ الحاد و بے دینی بہ ہر جا در فروغ
مغربیت جلوہ گر اما بہ قہر و اضطرار

در قلوبِ اہلِ ترکی بود ایماں موجزن
لیک گرُوہاً از ریاست بود آں مغرب شعار

از زمانے بود ترکی تحتِ مشقِ انقلاب
در پسِ پردہ است بازیہائے پنہاں بے شمار

باز در ایشاں حیاتِ دینِ حق آمد پدید
کفر گشتہ باز مخذول و ذلیل و خوار و زار

نور و ظلمت کے بود یکجا؟ محال است ایں سخن
با مسلماں کافر و مشرک نباشد یارِ غار

کفر ناشاد از فروغِ دینِ اسلام از قدیم
کے بُود از کفر یاری ایں سخن باور مدار

دینِ یورپ در دیارِ ترک گشتہ نامراد
بارِ دیگر بہرِ دینِ حق فضا شد سازگار

سطوتِ لادینی و الحاد آخر تا بکے
حامیِ اسلام باشد نصرتِ پروردگار

عالمِ اسلام را ابلاغ باشد مژدئے
منقطع فصلِ خزاں باز آمدہ فصلِ بہار

کامرانِ ہستند در ہر معرکہ احرارِ تُرک
آمدہ در تجربہ کردارِ ایشاں بار بار

بود در عہدِ خلافت قائدِ اسلام ترک
صف شکن ہستند و شیر افگن بمیداں شہسوار

کفر از کردارِ ایشاں لرزہ بر اندام بُود
خدمتِ اسلام ایشاں را ہمیشہ بُد شعار

حاملِ اخلاقِ خوش ہستند و بس مہماں نواز
حالِ ترکاں را بترکی دیدہ بودم من دو بار

ذوقِ دینداری بایشاں یافتم در ہر سفر
شوقِ حجِ کعبہ و عشقِ رسولِ تاجدار

چاک شد پیراہنِ یورپ بہ ترکی حبذا
آفریں بر ہمتِ بازوئے ایشاں صد ہزار

فتحِ اسلام از خدا خواہیم بعد از ہر نماز
ہم شکستِ کفر میخواہیم از پروردگار

یا الٰہی غازیانِ ترک را قوت بدہ
باز گرداں سطوتِ عہدِ خلافت برقرار

ہست سربازی یکے از دوستانِ آلِ ترک
ایں مودّت بر بنائے دینِ اسلام آشکار

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

صبر اور اُس کی قسمیں

"توبہ" کے بعد دوسرا قدم یہ ہے کہ انسان اپنی ظاہری اور باطنی زندگی کی اصلاح کی فکر کرے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے انھیں بجا لائے، اور جن چیزوں سے روکا ہے، ان سے باز رہے، ظاہری زندگی میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے انھیں "مامورات" کہا جاتا ہے مثلاً نماز روزہ وغیرہ اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے انہیں "منہیات" کہتے ہیں۔ مثلاً چوری، شراب نوشی وغیرہ۔ مامورات اور منہیات علم فقہ کا موضوع ہیں۔ اور یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

البتہ بالکل اسی طرح ہماری باطنی زندگی کے بھی کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اور کچھ ایسے ہیں جن سے روکا گیا ہے، علم تصوف کی اصطلاح میں پہلی قسم کے اعمال کو "فضائل" اور دوسری قسم کو "رذائل" کہا جاتا ہے۔ یہاں پہلے فضائل کا بیان کیا جائے گا؛ اس کے بعد "رذائل" کا

یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ جب انسان کو کسی "فضیلت" کی ایسی عادت پڑ جائے کہ وہ اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے تو اس کو تصوف کی اصطلاح میں "مقام" کہتے ہیں، لہذا جب ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے "مقام صبر" حاصل کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "صبر" کا باطنی عمل جو "فضائل" میں سے ہے، اس کے اندر خوب راسخ ہو کر اس میں اچھی طرح رچ بس گیا ہے۔

آج کی محفل میں "مقام صبر" کے بارے میں کچھ ضروری باتیں عرض کرنی ہیں:

"صبر" کے لغوی معنی ہیں "روکنا"، اور اسلامی اصطلاح میں "صبر" کی تعریف ہے:

"اپنے آپ کو ناجائز خواہشات سے روکنا"

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن کریم اور اسلام کی اصطلاح کے مطابق "صبر" کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کسی تکلیف یا رنج پر واویلا نہ کیا جائے (جیسا کہ عام گفتگو میں "صبر" کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے) بلکہ اس کے شرعی معنی بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں اور اس میں دین کے تقریباً تمام شعبے داخل ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر تاکید "مقام صبر" حاصل کرنے کی آئی ہے، اتنی تاکید شاید ہی کسی اور چیز کی آئی ہو، اور اس کا اجر و ثواب بھی اتنا بتلایا گیا ہے کہ شاید کسی اور چیز کا نہ بتایا گیا ہو، چنانچہ ارشاد ہے:

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر

تم ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی نصیحت کرو

اور فرمایا جاتا ہے:

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب

بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کے اجر سے بے حساب نوازا جائے گا۔

"صبر" کی مندرجۂ بالا اہمیت کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہوگی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں بھلائی کا مادہ بھی رکھا ہے، اور برائی کا بھی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

فألهمها فجورها وتقواها

اللہ نے انسان کی جان کو گناہ اور تقویٰ دونوں سے باخبر کردیا ہے۔"

اور چونکہ دنیا میں آزمائش کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان برائی کو چھوڑ کر بھلائی اختیار کرے۔ اس لئے اللہ نے بھلائی کے مادے کی تقویت کے لئے بھی کچھ سامان مقرر فرمائے ہیں اور برائی کے مادے کو تقویت دینے کے لئے بھی۔

انسان کو بھلائی کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک قوت تو خود انسان کے دل میں رکھی گئی ہے جسے "نفس لوّامہ" کہا جاتا ہے، اور عرف عام میں اس کا نام "ضمیر" ہے۔ ہر انسان جب کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو ایک ان دیکھی قوت اسے برائی سے روکتی ہے۔ یہی قوت "نفس لوّامہ" ہے، اس کے علاوہ کچھ خارجی طاقتیں ہیں جو انسان کو نیکی پر آمادہ کرتی اور برائی سے روکتی ہیں، یہ خارجی قوتیں "فرشتے" ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار مخلوق ہے اور اس میں برائی کا مادہ پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

دوسری طرف دو قوتیں ایسی ہیں جو انسان کو برائی کی طرف راغب کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک خود انسان کے باطن میں موجود ہے جسے "نفس امّارہ" کہا جاتا ہے۔ یہ نفسانی خواہشات کا وہ منبع ہے جو نیکیوں سے جی چرانے اور گناہ کی طرف مائل ہونے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور دوسری قوت "شیاطین" کی ہے جنھوں نے اپنا مقصدِ زندگی ہی یہ قرار دیا ہوا ہے کہ انسان کو نیکیوں سے ہٹا کر برائیوں کی طرف لیجائیں۔

ان دو متضاد قوتوں کی کشاکش ہی میں انسان کی آزمائش ہے، اور اس آزمائش میں کامیاب ہونے کے لئے یہ ضروری ہے انسان نیکی کے تقاضوں کو بدی کے تقاضوں پر غالب کردے اور اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں "صبر" ہے۔

اس مقام کا حصول محض زبانی جمع خرچ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے بڑی محنتیں کرنی پڑتی ہیں، صوفیاء کرام نے بیشتر مجاہدات اسی مقام کو حاصل کرنے کے لئے مقرر کئے ہیں، یہ جو بہت سے صوفیاء کرام سے منقول ہے کہ انھوں نے بعض مرتبہ مباحات کو بھی ترک کردیا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان مباحات کو حرام سمجھتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے نفسانی خواہشات کو قابو میں کرنے کے لئے ایسا کیا ہے۔

شروع میں انسان کو نفسانی خواہشات کے دبانے میں مشقت ہوتی ہے۔ لیکن جب ایک مرتبہ یہ کڑوی دوا پی لے تو پھر رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے یہ کام بہت آسان کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا نفس "نفسِ مطمئنّہ" بن جاتا ہے یعنی اس میں بھلائی کے تقاضے اس قدر غالب ہو جاتے ہیں کہ بدی کے تقاضے ان کے سامنے بالکل مردہ اور مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں، اسی بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ

من يتصبّر يُصبّره الله ؛

جو شخص مقام صبر تک پہنچنا چاہے، اللہ اسے صبر دیدیتا ہے

اور جس شخص کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کے بارے میں سرکارؐ کا ارشاد یہ ہے کہ:

لم يؤت احدٌ نعمةً اوسع من الصبر

(او کما قال)

کسی شخص کو صبر سے زیادہ وسیع نعمت کوئی نہیں دی گئی۔

اس مقام کو حاصل کرنے کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جنھیں صبر کی نعمت حاصل ہو تجربہ شاہد ہے کہ انسان کے ماحول اور صحبت سے زیادہ اسکا

مربی کوئی نہیں ہوتا، اگر انسان "صابرین" کا ماحول اختیار کرے تو رفتہ رفتہ خود بھی "صابر" بن جائے گا۔

اس کے علاوہ مقامِ صبر حاصل کرنے کا انفرادی طریقہ یہ ہے کہ جب بھی دل میں کسی گناہ کا خیال پیدا ہو، اس کے ساتھ اُس عذاب اور وعید کا تصور جائے جو قرآن کریم اور احادیث میں اس گناہ کے کرنے والے کے لئے بیان فرمایا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اپنی موت، انجام اور قبر کی تنہائی کو یاد کرے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے کہ:

اکثروا ذکر ھاذم اللذات

"تمام لذتیں ختم کر دینے والی چیز (یعنی موت) کو کثرت سے یاد کیا کرو۔"

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے "صبر" کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور جن کی نیکیوں کی قوت بدی کی قوت پر غالب ہے، انہیں بھی کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خلفاء کو اس کی تلقین فرماتے تھے کہ وہ کسی وقت اپنی اصلاح سے غافل نہ ہوں، ایک دن خلفاء سے خطاب کرتے ہوئے حضرتؒ نے مولانا روم رح کی مثنوی کی ایک حکایت نقل فرمائی کہ ایک لکڑہارا روزانہ منہ اندھیرے جنگل جاتا اور شام کو لکڑیاں لیکر لوٹتا تھا، ایک دن ایک لکڑی کے ساتھ ایک سردی سے ٹھٹھرا ہوا سانپ بھی بندھ کر آگیا، راستہ بھر تو وہ بے حس و حرکت رہا اور لکڑہارے کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا، لیکن جب گھر پہنچکر اس میں کچھ گرمی پیدا ہوئی تو اس نے ابھرنا شروع کیا اور لکڑہارے کے لئے خطرۂ جان بن گیا۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ "نفس امّارہ" کی مثال بالکل اس ٹھٹھرے ہوئے سانپ کی سی ہے جو مرا نہیں، بلکہ وقتی طور پر افسردہ ہو گیا ہے ؎

نفس اژدہا است او کے مردہ است
از غم بے آلتی افسردہ است

اس لئے اس سے غافل اور بے فکر ہونے کے کوئی معنی نہیں
یہ واقعہ نقل کرکے حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ بات میں صرف آپ ہی سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ خود اپنا نفس بھی میرا اساسی طور سے مخاطب ہے، اور بحمد للہ اس بات پر کاربند بھی ہوں، اور یہ کہکر اپنے ڈیسک سے کچھ پرچے نکالکر دکھلائے جن پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی تھیں، اور فرمایا کہ میں اپنے اندر جو کمزوریاں محسوس کرتا ہوں یہ پرچے ان کے علاج کے لئے ہیں۔

اس کے برعکس اگر انسان اس مقامِ "صبر" کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کرے تو نفسانی خواہشات اُسے پچھاڑ ڈالتی ہیں، اور وہ ان کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایک مؤمن کے لئے اس سے زیادہ خطرناک بات کوئی نہیں

حدیث میں ہے کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اور اگر آدمی اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور مسلسل گناہوں میں ملوث ہوتا چلا جائے تو رفتہ رفتہ یہ سیاہی پورے دل کو گھیر لیتی ہے اور جب آدمی اس مرحلے پر پہنچ جائے تو وہ گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے، اور ضمیر کی قوت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ اسے کوئی گناہ گناہ محسوس نہیں ہوتا۔

حسیات میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اگر کسی شفاف کپڑے پر کوئی دھبہ لگ جائے تو وہ ہر وقت نگاہوں میں کھٹکتا ہے اور اسے مٹانے کی فکر بھی پیدا ہوتی ہے لیکن اگر کپڑے پر بیشمار دھبے لگ جائیں تو ان کی وہ برائی دل میں باقی نہیں رہتی۔ اور انہیں مٹانے کی فکر بھی کم ہو جاتی ہے۔

بس اسی طرح اگر دل پر لگنے والے پہلے داغ کو توبہ کے ذریعہ نہ دھویا گیا اور اس کے بعد "صبر" کے ذریعہ احتیاط نہ کی جائے تو پورا نفس داغدار ہو جاتا ہے۔ اور اسی کو حدیث

ے زنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اصلاح کی لگن اور آخرت
تا ہے، انھیں ہر وقت اس بات کی طرف توجہ رہتی
فس "صبر" کا دامن چھوڑ کر گناہوں کا عادی
ے۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
یک مرتبہ ڈاک میں ایک لفافہ ایسا آیا کہ اس پر ٹکٹ

تو لگا ہوا تھا مگر مہر نہ تھی، حضرت رح نے اسے چاک کرکے
پھینک دیا، اور فرمایا کہ اگرچہ حکومت ہم سے بہت سا
روپیہ ناجائز طریقوں سے وصول کرتی ہے، اس لئے ہیں
فتوے کی رو سے یہ حق ہے کہ ہم اس طرح اپنا حق جس قدر
ہو سکے وصول کرلیں، لیکن ان طریقوں کو اس لئے استعمال نہیں
کرتا کہ اس طرح نفس کو حیلے نکالنے کی بری عادت پڑتی ہے۔

سخنہائے گفتنی

یدان صحافت میں کسی جریدہ کی شائع شدہ کوئی چیز بلا حوالہ نقل کرلینا کسی دور میں سرقہ شمار ہوتی تھی اور اس کے مرتکب
رو سے ہوتی تھی! ——— مگر اب یہی بداخلاقی، بڑے ثقہ حضرات بڑی آن بان کے ساتھ فرماتے ہیں اور انھیں یہ
ں نہیں ہوتا کہ اخلاق کا تقاضا کیا ہے؛ ——— البلاغ ایک تبلیغی جریدہ ہے، اس میں شائع ہونے
ین پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ کسی جگہ نقل نہ کئے جائیں، مگر اخلاق کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ اس کا حوالہ ضرور دیا جائے، مگر
ے کے متعدد اخبارات و جرائد ان مضامین کو اس طرح نقل فرماتے ہیں گویا جناب مضمون نے وہ مضمون خاص انہی کیلئے تحریر فرمایا ہو!
بلاغ کی ایک اشاعت میں مکتوب نبوی بنام کسریٰ کے عنوان سے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع ہوا تھا،
ے کئی اخبارات نے یہ مضمون بلا حوالہ چھاپا حتیٰ کہ اس کے فوٹوؤں کا عکس بھی۔
ب اگر یہ صحافتی اخلاق و آداب کے خلاف ہے (اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہے) تو ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں، اور گذارش کرتے ہیں کہ
مضامین بشوق نقل کئے جائیں؛ مگر البلاغ کا حوالہ ضرور دیا جائے۔
اور دیکھئے ہمارے بعض قارئین نے شکایت لکھی ہے کہ ان کو کئی ماہ سے پرچہ نہیں مل رہا تھا ایک ماہ کا رسالہ آیا تو لفافہ
ہ کا مطبوعہ تھا، مگر اندر پرچہ "طلوع اسلام" تھا اس بدترین قسم کی بددیانتی کا ذمہ دار کس کو کہا جائے؟ ظاہر ہے یا تو یہ ہماری
ہے یا اس واسطہ کی جو ہمارے اور ہمارے خریدار حضرات کے مابین ہے! اور وہ صرف ایک ہی ہے یعنی ڈاک خانہ! ہم بقسم کہنے کو تیار ہیں
کے مرتکب نہیں ہوئے۔ کیا محکمۂ ڈاک کے ارباب بست و کشاد اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ محکمہ کو بدنام کرنے والوں
ے کیسے کیا جائے، اور دیانت و خدمت کے مدعیان کی بددیانتی کا سد باب کیونکر ہو! خدا کے خوف سے ٹھنڈا معاشرہ ہمیں کدھر
ہے یہ ہر اہل درد مند مسلمان کے لئے لمحۂ فکریہ ہے!
۲۰ اگست ۶۸ء کو راقم الحروف ایک حادثہ کا شکار ہو کر دو ہفتہ تک صاحب فراش رہا، اللہ کا بڑا کرم اور فضل ہوا، کہ
چوٹ سے محفوظ رہا ——— اس دوران دفتری نظم و نسق بھی متاثر ہوا، اور بہت ممکن ہے قارئین محترم کو اس سلسلہ
شکایات بھی پیش آئی ہوں، اور وہ ہم سے ناراض ہوں، اطلاع محض اسی بنا پر دی جا رہی ہے کہ وہ ہماری مجبوری سے واقف ہو جائیں اور
شکایات کا ازالہ ہو جائے!
(نعمانی)

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند

خواتین اسلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں

بائیسویں حدیث

وعن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت قال لی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا عائشۃ ان اردت اللحوق بی فلیکفک من الدنیا کزاد الراکب وایاک ومجالسۃ الاغنیاء ولا تستخلقی ثوبا حتی ترقعیہ۔

(رواہ الترمذی) (مشکوۃ شریف ص ۳۷۵)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ رض اگر تو (آخرت میں) مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو تجھے دنیاوی زندگی گذارنے کے لئے اتنا (مختصر سا) سامان کافی ہونا چاہئے جتنا مسافر ساتھ لیکر چلتا ہے، اور مالداروں کے پاس نہ بیٹھنا، اور کسی کپڑے کو پرانا (یعنی ناقابل استعمال) نہ سمجھنا جبتک کہ اسے پیوند لگا کر نہ پہن لے۔ (ترمذی شریف)

تشریح: اس حدیث میں تین اہم نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں جو بڑی اکسیر ہیں، پہلی نصیحت یہ فرمائی کہ دنیاوی گذارہ کے لئے معمولی سامان سے کام چلاؤ مسافر جتنا سامان ہمراہ لیکر جاتا ہے اتنے سے سامان میں گذارہ کرو، زیادہ سامان زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اکثر حلال مال سے فضولیات اور فرنیچر اور زیب و زینت کے اخراجات پورے نہیں لامحالہ ان کے لئے حرام کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور آخرت میں جو مال کا حساب ہوگا وہ بھی بقدر مال ہوگا، کم آمد اور کم وہاں مزے میں رہیں گے، اس لئے دنیاوی زندگی کا سامان جس قدر کم ہو بہتر ہے، آجکل سامان بڑھانے کی دوڑ ہے ہر ا فرنیچر پر اور نئے نئے ڈیزائن کے بنگلوں پر اور طرح طرح کے غیر ضروری امور پر خرچ ہو رہے، غریب سے غریب کو بھی کی طلب ہے اور ریڈیو، ٹیلی ویژن کی رغبت ہے، مخملی قالین اٹھنے بیٹھنے کے لئے نہیں بلکہ محض بچھانے کے لئے چاہئیں جس سے روندتے رہیں، بہنو! یہ ڈھنگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امتیوں کے نہیں ہیں، حضور اقدس صلی اللہ تعا نے جب اپنے خاص صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو نصیحت فرمائی کہ ایاک وا فان عباد اللہ لیسوا بالمتنعمین[1] (یعنی مزے اڑانے سے بچنا کیونکہ اللہ کے بندے مزے اڑانے والے نہیں ہوتے

---

[1] مشکوۃ شریف ص ۴۴۹

...تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
...یا کہ

...رضی من اللہ بالیسیر من الرزق
...اللہ منہ بالقلیل من العمل

...جو شخص اللہ کی جانب سے ملنے والے تھوڑے
...پر راضی ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے
...سے راضی ہو جاتے ہیں۔)

(بیہقی فی شعب الایمان)

...تبہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی
...سو کر اٹھے تو جسم شریف پر چٹائی کی بناوٹ کے
...گئے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ نے عرض کیا
...آپ حکم فرماویں تو ہم آپ کے لئے اچھا بچھونا
...اور اچھی اچھی چیزیں حاصل کر کے آپ کے لئے
...آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ مجھ کو دنیا سے کیا تعلق؟
...ے بس ایسا ہی واسطہ ہے جیسے کوئی مسافر (درخت
...یہ لینے کے لئے بیٹھ گیا اور پھر اسے چھوڑ کر چلدیا
...ہر حال اور ہر کام میں اپنے پیارے نبی صلی اللہ
...کی پیروی کرنا لازم ہے، آجکل کے مسلمان اور
...جوان لڑکوں اور لڑکیوں نے غیر قوموں کو دیکھ کر
...خرچ بڑھا لئے ہیں کہ نہ وہ ضروری خرچ ہیں نہ ان پر
...وقت ہے۔ فیشن کی بلا ایسی سوار ہوئی ہے اور ظاہری
...ب اتنی بڑھا رکھی ہے کہ جتنی بھی آمدنی ہو سب کم
...ہے، اور قرض پر قرض چڑھتا چلا جاتا ہے۔

...یک صحابی تھے مخاؤ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے
...تم تکلیفوں کے ذریعہ جانچ میں ڈالے گئے تو تم نے صبر
...ریب مال کے ذریعہ تمہاری جانچ کی جائے گی، اور
...سے زیادہ خوف تمہارے متعلق یہ ہے کہ عورتوں کے
...ال دیئے جاؤ گے جبکہ عورتیں سونے چاندی کے کنگن
اور شام دمشق کے باریک اور عمدہ کپڑے استعمال
کریں گی (یہ چیزیں مہیا کرنے کے لئے) مالدار کو تھکا دیں گی
اور مفلس سے وہ مانگیں گی جو اس سے نہ ہو سکے گا۔

(حلیۃ الاولیاء)

صفائی ستھرائی تو اچھی چیز ہے مگر لباس اور فیشن کی
دوسری بے جا ضرورتیں جو یورپ والوں نے نکالدی ہیں
مسلمانوں کے لئے کسی طرح بھی ان کے حاصل کرنے کے خیال
میں پڑنا اور ان کو استعمال کرنا ٹھیک نہیں ہے، ان کی
اندھی تقلید میں یہ حال بن گیا ہے کہ دیکھنے میں خوشحال اور
دل میں پریشان، آمدنی معقول مگر گذارہ مشکل، اطمینان اور
بے فکری کا نام نہیں۔ محبت کے جوش میں بچوں کی پرورش
شروع سے ہی ایسے اعلیٰ پیمانہ پر کرتے ہیں کہ بعد میں ان کی
کمائی ان خرچوں کو برداشت نہیں کر سکتی ہے، جو کچھ پاس
ہوتا ہے بچہ کے فیشن پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اور جب بیچارہ
کچھ لکھ پڑھ کر ملازم ہوتا ہے یا کاروبار شروع کرتا ہے تو
پریشان ہو جاتا ہے، بال بچوں کا خرچ۔ ماں باپ کی
خدمت، اپنی پوزیشن اور سوسائٹی کا خیال ایک جان کو
ہزاروں مصیبتیں لگی ہوتی ہیں، غرضیکہ پوری خانہ داری کا
بوجھ اٹھانا وبال جان ہو جاتا ہے، لڑکیوں کو فیشن کا اس
قدر شوقین بنا دیا جاتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کو اپنے زیادہ
خرچوں کی عادی بنا دیتے ہیں کہ شادی کے بعد شوہر
پر بوجھ ہو جاتی ہے۔ خاوند کی ساری آمدنی، فیشن،
لباس اور زیور کی نذر ہوتی ہے، ناچارہ نا اتفاقی اور بدمزگی
ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اور زیادہ بناؤ سنگار کی عادت
ڈالنے سے تلاوت قرآن پاک، درود و استغفار، دینی
معلومات میں لگنے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ پھر اصل سجاوٹ
تو باطن یعنی دل اور روح کی سجاوٹ اور پاکیزگی ہے، جسم
ولباس کی عمدگی بھی اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب دل
ستھرا، اخلاق اچھے، عادتیں پاکیزہ ہوں۔ اخلاق گندہ
اور ظاہر اچھا اس کی ایسی مثال ہے جیسے گندگی کو ریشم میں

پیٹ کر کھدیا جائے۔ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ضرورت اس کو کہتے ہیں
جس کے بغیر زندگی دو بھر ہو جائے خوب سمجھ لو اور اپنے اخراجات کا جائزہ لے لو

دوسری نصیحت حدیث شریف میں یہ فرمائی کہ مالداروں کے
پاس نہ بیٹھا کرو، یہ بہت کام کی نصیحت ہے مالدار اکثر دنیادار ہوتے
ہیں ان کی صحبت سے دنیا کی طلب بڑھتی ہے اور آخرت کی رغبت گھٹتی
ہے ایمان کا مال اور حال دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اللہ نے ان کو بہت کچھ دیا ہے
اور ہم محروم ہیں اس کی وجہ سے ناشکری ہوتی ہے، حالانکہ کوئی شخص ایسا
نہیں جس سے کمتر کوئی نہ ہو، شکر گذار بننے کا طریقہ یہ ہے کہ جو اپنے سے کم ہے
اس کو دیکھے۔ مسلم شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا
اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔

(دنیاوی سامان اور روپیہ پیسہ میں) جو تم سے کم ہے
اس کو دیکھو اور جو تم سے بڑھا ہوا ہے اس کو نہ دیکھو
ایسا کرنے سے اللہ کی ان نعمتوں کی ناقدری نہ
کرسکو گے جو اس نے تمکو عنایت فرمائی ہیں۔

اس کو دوسرے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس
طرح فرمایا کہ جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اس کو
شاکر اور صابر لکھ دیں گے جس نے دین میں اس کو دیکھا جو اس
سے بڑھ کر ہو اور پھر اس کی پیروی کی اور دنیا میں اس کو
دیکھا جو اس سے کم ہے اور اس کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ آپ
نے مجھے اس شخص پر فوقیت دی ہے ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ
شاکرین اور صابرین میں شمار فرمائیں گے اور جس نے دین میں
ایسے شخص کو دیکھا جو اس سے کم ہے اور دنیا میں ایسے شخص کو
دیکھا جو اس سے زیادہ ہے اور پھر ان چیزوں پر افسوس کیا
جو (دنیا میں) اس کو نہیں ملیں تو اسے اللہ تعالیٰ شاکرین اور
صابرین میں شمار نہ فرمائیں گے (مشکوٰۃ ص ۴۴۸ عن الترمذی)

نیز مالداروں میں اکثر فاسق و فاجر بدکار بے نمازی
ہوتے ہیں ان کی دولت پر رال ٹپکانا بہت بر
ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی فاجر (بدک
دیکھ کر رشک نہ کرو کیونکہ تمہیں معلوم نہیں کہ مو
اس کا کیا حال بننے والا ہے، بلاشبہ اس کے لئے
پاس ایک جان لیوا ہے یعنی دوزخ کی آگ (
سامان بہت جمع کر لیا اور وہاں عذاب بھگتنا
نفع ہوا؟ خوب سمجھ لو) اور عذاب دوزخ گوا
ہوگا کہ اس کی تکلیف سے آدمی مرجائے گا
نہیں، عذاب بھگتتا رہے گا۔ لایموت فیہا و

اللھم احفظنا من مصائب الدنیا وعذاب الآخ

تیسری نصیحت حدیث شریف میں یہ فر
کو اس وقت تک پرانا یعنی ناقابل استعمال
جبتک کہ اس کو پیوند لگا کر نہ پہن لو، مطلب
اس اعتبار سے پرانا مت سمجھنا کہ بہت د
ہو رہا ہے بلکہ کپڑا جب تک سالم رہے ا
تک تو استعمال کرتے ہی رہو اور جب پھٹنا
تب بھی اس کو ناقابل استعمال سمجھنے میں جل
بلکہ اس میں پیوند لگا کر پہنتے رہو۔ اس پر عمل
جلدی جلدی کپڑے بنانے کی ضرورت نہ ہوگی
کمائی کا فکر نہ کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی ساتھ
پسندی اور دوسروں کو حقیر جاننے کا جذبہ بھی
یہ نصیحت اگرچہ آجکل کی نئی پود کے لڑکوں
کی سمجھ میں نہ آئے گی کیونکہ دنیاداری خود
کا ماحول ہے مگر نصیحت ہے بہت کام کی جو کوئی
دنیا و آخرت کا سکون نصیب ہوگا اور آخرت
بھی ملے گی گو بعض اہل دنیا پیوند کا کپڑا د
جائیں گے۔

جناب اعجاز احسن خان سنگھانوی

تراشے

جانوروں پر حکومت

حضرت عقبہ رض بن نافع فہری کو امیر معاویہ رض نے افریقہ کا عامل مقرر فرمایا اور حضرت عقبہ رض نے افریقہ کے اکثر حصہ کو فتح کر لیا۔ قوم بربر جو اصلی باشندے تھے ان میں سے بہت سے قبائل مسلمان ہو گئے تھے، لیکن جب مسلمان افریقہ سے واپس ہو جاتے تو نو مسلم بربر بھی مخالفوں کے ساتھ مل جاتے اور تمام عہد و پیمان توڑ دیتے اور جو مسلمان موجود ہوتے انھیں تباہ کرنے میں کچھ کسر نہ رکھتے یہ حالت دیکھ کر حضرت عقبہ رض نے ارادہ فرمایا کہ مناسب موقعہ پر مستقل چھاونی ڈالدی جائے۔ جہاں پر مسلمانوں کی فوج جمع رہے لیکن اس غرض کے لئے جس موقعہ کو پسند فرمایا وہاں اس قدر دلدل اور گھنے درخت تھے کہ آدمی یا بڑے جانور تو درکنار سانپوں کو بھی ان درختوں میں سے ہو کر نکلنا دشوار تھا۔ یہ جنگل درندوں اور ہر قسم کے موذی اور زہریلے جانوروں کا مسکن تھا، ایسی سرزمین میں آدمی کی بودوباش تو کیا گذرنا بھی خطرناک امر تھا، مگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ہر ایک ارادہ باذن الٰہی ہوتا تھا وہ جو کچھ کرتے تھے اللہ تع کے بھروسہ پر کرتے تھے۔ اس لشکر میں اٹھارہ صحابی رض موجود تھے، حضرت عقبہ رض امیر لشکر سب کو جمع فرما کر اس میدان میں لے گئے اور حشرات وسباع کو خطاب کر کے فرمایا

أَيَّتُهَا الْحَشَرَاتُ وَالسِّبَاعُ نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَارْحَلُوا فَإِنَّا نَازِلُونَ فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ۔

اے درندو اور موذی جانورو، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس جگہ آباد ہونا اور قیام کرنا چاہتے ہیں تم یہاں سے چلے جاؤ اور قیام کرنا چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم جس کو دیکھیں گے قتل کر دیں گے۔

اس آواز میں معلوم نہیں کیا تاثیر تھی کہ سب حشرات اور درندے اسی وقت جلا وطن ہونے کے لئے تیار ہو گئے جماعتیں کی جماعتیں وہاں سے نکلنا شروع ہو گئیں، شیر اپنے جوڑے کے ساتھ۔ بھیڑیے اپنے بچوں کو لئے ہوئے سانپ اپنے سپولیوں کو کمر سے چمٹائے ہوئے نکلے چلے جاتے تھے، یہ ایک ہیبتناک و عجیب انگیز منظر تھا کہ جو اس سے قبل کہیں نہ دیکھا گیا تھا۔

قوم بربر نے جب اپنی آنکھ سے یہ مشاہدہ کیا تو اسی وقت ہزارہا بربری صدق دل سے ایمان لے آئے اور

اسلام کے حلقہ بگوش غلام بن گئے۔

(اشاعت اسلام حصہ دوم ص ۹۲)

ساتوں بیٹے بدری

حضرت عفراء رضی اللہ عنہا صحابیہ ہیں ان میں ایک خاص خصوصیت ہے جو کسی اور صحابیہ میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ کہ عفراء نے اول نکاح حارث سے کیا۔ حارث سے تین بیٹے ہوئے۔ عوف، معوذ اور معاذ رضی اللہ عنہم۔ حارث کے بعد بکیر بن یالیل سے نکاح کیا جس سے چار لڑکے ہوئے ایاس، عاقل، خالد اور عامر رضی اللہ عنہم۔

اور یہ ساتوں بیٹے تین پہلے شوہر کے اور چار دوسرے شوہر کے سب کل کے کل غزوۂ بدر میں شریک رہے۔ ایسی صحابیہ جن کے ساتوں بیٹے بدر میں شریک ہوئے ہوں صرف عفراء ہیں رضی اللہ عنہا (سیرۃ المصطفیٰ ص ۱۰۲ ج ۲)

حضرت جبرئیل کا گھوڑا

حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کا نام حیزوم تھا حضرت جبرئیل امین غزوۂ بدر میں فرشتوں کی جماعت کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کے لئے تشریف لائے تھے، ربیع بن انس سے مروی ہے کہ بدر کے دن فرشتوں کے مقتولین انسانوں کے مقتولین سے علیحدہ طور پر پہچانے جاتے تھے۔ مقتولین ملائکہ کی گردنوں اور پوروں پر آگ کے سیاہ نشان تھے۔

(سیرۃ المصطفیٰ ص ۸۴ ج ۲)

دھوپ کا پانی

جو پانی دھوپ سے گرم ہو گیا ہو اس کے استعمال سے برص کی بیماری کا اندیشہ ہے۔

عَنْ عُمَرَ قَالَ لَا تَغْتَسِلُوْا بِالْمَاءِ الشَّمْسِ فَاِنَّهٗ يُوْرِثُ الْبَرَصَ (دار قطنی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا دھوپ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل مت کرو چونکہ وہ برص (کا مرض) پیدا کرتا ہے۔

شیخین

شیخین دو ٹیلوں کا نام ہے جو مدینہ اور احد کے مابین واقع ہیں وہاں ایک اندھا اور بوڑھا یہودی ایک اندھی اور بڑھیا یہودن رہا کرتے تھے اس لئے وہ دونوں ٹیلے شیخین کے نام سے مشہور ہو گئے۔

(سیرۃ المصطفیٰ ص ۱۰۳ ج ۲)

قادسیہ

قادسیہ کوفہ کے قریب ایک شہر ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہاں گذر ہوا تو ایک بڑھیا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سر اور کپڑے دھو کر صاف کئے جو سفر کی وجہ سے میلے ہو گئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

قُدِّسَتْ هٰذِهِ الْاَرْضُ

یہ زمین پاکیزہ ہو۔

اسی وقت سے اس جگہ کا نام قادسیہ مشہور ہو گیا (اشاعت اسلام ۹۵)

حافظ بڑھیا

حجاج بن یوسف جیسا ظالم اور سنگدل تھا ایسا ہی حفظ قرآن میں بے مثال تھا ایک مرتبہ ایک بڑھیا حجاج بن یوسف کے پاس آئی اور کچھ معاملہ پیش کیا اور اس پر کہا کہ اگر تو نے یہ نہ کیا تو خداوند تعالے تجھ کو زمین سے ایسا اڑا دے جیسا کلا کو نصف اول قرآن سے اڑا دیا۔ حجاج نے ذرا گردن جھکائی اور پھر سر اٹھایا اور بڑھیا سے کہا کہ اگر نصف اول قرآن میں کہیں کلا ہوتا تو میں تجھ کو ابھی قتل کر دیتا مگر میں نہیں پاتا اس لئے تجھ کو کچھ نہیں کہتا (اشاعت اسلام حصہ دوم ص ۹۷)

(بقیہ مضمون " امام زفر بن ہذیل ")

امام زفرؒ کے پاس ایک مسئلہ آیا کہ ایک آدمی نے اپنی ایک کنیز کو ایک ہزار درہم کے عوض میں دوسرے شخص کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا کہ وہ قیمت کو ۳ دن کے اندر اندر ادا کر دے گا ورنہ یہ بیع قائم نہ رہے گی، امام زفر نے فرمایا کہ یہ بیع فاسد ہے۔

طلباء کی محفل

محمد علی
سال ششم دار العلوم کراچی

امام زفر بن ھذیلؒ

(یہ مضمون علامہ زاہد الکوثریؒ کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہے ——— رم۔ ع)

امام زفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد ماجد ھذیل عنبری یزید بن ولید بن عبد الملک اُموی کی خلافت کے زمانے میں اصفہان کے گورنر تھے، اسی جگہ اصفہان میں سنہ ۱۱۰ھ میں امام زفر بن ہذیل عنبری پیدا ہوئے۔ ہذیل کے چار فرزند تھے۔ کوثر، ھرثمہ، صباح اور زُفر۔ امام زفر کا سلسلہ نسب بائیسویں پشت میں عدنان سے مل جاتا ہے۔ یہ عدنان حضور علیہ السلام کے پشت کے دادا ہیں۔ امام زفر ہاشمی النسل تھے، ان کے والد جو اصفہان کے رہنے والے تھے اصفہان ہی میں ان کا انتقال ہوگیا، ان کے بھائی صباح ابن ھذیل بنی تمیم کے صدقات و زکوٰۃ وصول کرنے پر عامل تھے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کی شاگردی

امام زُفرؒ حدیث کے بڑے عالم اور بڑے عابد و زاہد، مجتہد تھے، ان کا اپنا ایک حلقہ تھا۔ ایک دفعہ ایک مشکل مسئلہ درپیش ہوا، بہت کوشش کی مگر امام زفر اور ان کے احباب اس مسئلہ کی الجھن کو سلجھا نہ سکے، اور کوئی جواب بن نہ پڑا، آخر کار امام زفر امام صاحب کے پاس حاضر ہوئے، اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ امام اعظم ابو حنیفہ رح نے کافی وشافی جواب دیا۔

امام زفر: آپ نے یہ جواب کس دلیل سے دیا ہے؟

امام اعظم: فلاں حدیث سے اور اس طرح قیاس کر کے۔

امام اعظم: اگر مسئلہ کی نوعیت اس طرح ہو تو پھر اس کا کیا جواب ہوگا؟

امام زُفر: میں اپنے آپ کو پہلے مسئلے سے بھی زیادہ اس مسئلہ میں عاجز پاتا ہوں۔

امام اعظم: یہ جواب ہے اور یہ اس کی دلیل ہے۔

امام اعظم: اچھا اگر اس ہی مسئلہ کی نوعیت اس طرح ہو تو؟

امام زُفر: میں اس مسئلہ کا بھی جواب دینے سے قاصر ہوں

امام زفر فرماتے ہیں، کہ میں امام صاحب کے پاس سے واپس آگیا اور میں نے اپنے دوستوں سے یہ سوالات، ان کے جوابات اور ان جوابات کی دلیلیں بیان کیں تو وہ یہ سن کر بہت حیران ہوئے اور پوچھا کہ آپ ان مسائل کا حل کہاں سے لائے ہیں؟ امام زفر نے جواب دیا، کہ میں یہ مسائل امام اعظم ابو حنیفہ رح کے پاس سے لایا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد تو میں ان تین مسائل کے ذریعہ سے اپنے دوستوں کے حلقہ کا استاد بن گیا۔ پھر امام زفر، امام صاحب کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے، اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ آپ امام صاحب کے دس اکابرین میں سے ایک ہوگئے، جنھوں امام صاحب کی معیت میں بہت سی کتابیں تدوین کی ہیں۔

امام زفر کی شان میں علماء کے بیانات

محمد بن عثمان فرماتے تھے کہ میں نے اپنے والد اور چچا ابوبکر سے امام زفر کے متعلق پوچھا تو دونوں نے فرمایا کہ امام زفر اپنے زمانے کے سب سے بڑے فقیہ تھے، والد صاحب نے فرمایا کہ ابونعیم امام زفر کو عظیم المرتبت سمجھتے تھے، اور ابونعیم فرماتے تھے کہ یہ عظیم الشان فقیہ ہیں۔

امام اعظم کا خطبہ

عمرو بن سلیمان عطار فرماتے ہیں کہ میں کوفہ میں تھا، اور امام صاحب کی مجلس میں آیا جایا کرتا تھا، امام زفر نے نکاح کیا، اور اس میں اپنے استاد امام اعظم ابوحنیفہ کو مدعو کیا، امام زفر نے امام صاحب سے عرض کیا کہ آپ خطبہ پڑھیے امام صاحب نے خطبہ پڑھا اور دوران خطبہ میں فرمایا۔ "یہ زفر ابن ہذیل ہیں، یہ ائمۃ المسلمین میں سے ایک بڑے امام ہیں۔ اور یہ اپنے حسب ونسب اور علم وشرافت میں دین اسلام کے ستونوں میں سے ایک بڑے ستون ہیں۔" امام زفر کے قبیلہ میں سے ایک آدمی نے کہا کہ ابوحنیفہ کے علاوہ دوسرا کوئی شخص خطبہ دیتا۔ اور امام زفر کے یہ اوصاف بیان کرتا تو ہم کو اس سے زیادہ مسرت ہوتی بعض لوگوں نے برا سمجھا اور کہا کہ تمہارے قبیلے کے شریف اور کنبہ کے لوگ موجود تھے، ان حضرات کے ہوتے ہوئے آپ نے ابوحنیفہ کو خطبہ دینے کے لئے کیوں فرمایا؟ امام زفر نے کہا، اگر اس مجلس میں میرے والد صاحب بھی حاضر ہوتے تو میں ان پر بھی امام اعظم کو مقدم کرتا۔

امام زفرؒ کی عظمت شان کے لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہ چند جملے کافی ہیں۔

حضرت حسن ابن زیادؒ فرماتے ہیں کہ امام زفر اور حضرت داؤد طائیؒ آپس میں ایک دوسرے کے مماثل تھے، لیکن داؤد طائیؒ فقہ کو چھوڑ کر عبادت و ریاضت کی طرف مائل ہوگئے۔ اور امام زفر نے عبادت کے ساتھ فقہ کو بھی جمع کیا، اور امامت کا رتبہ حاصل کیا، حضرت حسن ابن زیاد فرماتے ہیں کہ امام زفر عام طور سے کسی کے ساتھ مناظرہ نہیں کرتے تھے۔ مگر جب کبھی مناظرہ ہوجاتا تھا تو آپ غالب آتے تھے، امام زفرؒ نے فرمایا کہ میں کسی سے مناظرہ اس لئے نہیں کرتا کہ وہ اپنی خطا کا اعتراف کرے۔ لیکن میں اس طرح مناظرہ کرتا ہوں کہ مقابل مجنون ہوجاتا ہے۔ امام زفر سے کسی نے سوال کیا کہ وہ مجنون کیسے ہوجاتا ہے؟ تو امام زفر نے فرمایا کہ مقابل ایسی ایسی بے تکی باتیں کرنے لگتا ہے جیسے مجنون کرتے ہیں۔

ملیح ابن وکیع نے فرمایا کہ میرے والد فرمایا کرتے تھے کہ امام زفر بڑے متقی پارسا اور بہت ہی اچھا قیاس کرنے والے تھے، بہت کم لکھتے تھے، مگر جو لکھتے تھے اس کو حفظ کرلیتے تھے۔

محمد ابن حاتم نے فرمایا کہ میں نے امام حدیث یحییٰ ابن معین سے سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ امام زفر بڑے صاحب الرائے معتمد، ثقہ اور بہت ہی پاکدامن متقی پارسا تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں نے ابونعیم سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ امام زفر بڑے ثقہ اور متقی پارسا تھے، اور یہ ان کو بہت عظیم الشان اور عظیم المرتبت انسان مانتے تھے۔ ابونعیم نے کہا یہ گھر جس میں اب یہ پنیر فروش رہتا ہے یہ امام زفر کا گھر تھا، یحییٰ بن معین نے کہا کہ امام زفر کا گھر بصرہ میں کیسے؟ ابونعیم نے جواب دیا کہ یہ گھر امام زفر کو میراث میں ملا تھا۔ اور پھر بصریوں نے ان کو یہاں ٹھہرالیا تھا۔

ابراہیم بن مغیرہ فرماتے ہیں کہ وکیع ابن جراح سے میں نے پوچھا کہ آپ امام زفر کے پاس آمدورفت کیوں رکھتے ہیں، امام وکیع نے جواب دیا کہ تم نے تو ہم کو ابوحنیفہ کے بارے میں بہت دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب تم امام زفر کے متعلق ہم کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہو، تاکہ ہم ابو اُسید اور اس کے اصحاب کے محتاج ہوجائیں۔

محمد ابن مقاتل نے فرمایا کہ میں نے ابونعیم سے سنا ہے

کہ وہ فرماتے تھے کہ مجھے امام زفر نے فرمایا کہ تم اپنی حدیث کو میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں اس کی چھان بین کر کے درست کر دوں۔

حافظ حدیث امام ذہبی نے فرمایا کہ امام زفر تارک الدنیا فقہا میں سے تھے زبان کے بڑے سچے تھے یحییٰ ابن معین اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے امام زفر کو رجال ثقات میں شمار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ وہ بڑے ہی قوی الحافظ تھے اور اپنے کسی ساتھی کے مسلک کی پیروی نہ کرتے تھے۔ وہ امام ابوحنیفہ کے اصحاب میں سب سے اچھے قیاس کرنے والے تھے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ امام ابویوسفؒ اور امام زفرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ دونوں حضرات آپس میں مناظرہ کر رہے تھے۔ امام ابویوسف رحؒ کثرت حدیث اور کثرت روایت عن ابی حنیفہ کے ذریعہ امام زفرؒ پر غالب آجاتے تھے اور جب قیاس کی نوبت آتی تو امام زفر غالب آجاتے تھے۔

امام زفرؒ کے شیوخ اور تلامذہ

مناقب الکردری میں ہے کہ امام زفرؒ نے فرمایا کہ میں امام اعظم کی خدمت میں بیس سال سے زیادہ رہا میں نے ان جیسا خیر خواہ اور لوگوں پر شفقت کرنے والا نہیں دیکھا۔ اور امام صاحب نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ امام اعظم دن کے اکثر اوقات فقہی مسائل کے حل کرنے میں تعلیم و تربیت میں اور دوسرے مختلف الانواع کاموں میں منہمک رہتے تھے، جب امام اعظمؒ اپنی مجلس سے اٹھتے تو کسی مریض کی عیادت کو جاتے یا کسی جنازہ کے ہمراہ جاتے۔ یا کسی فقیر کی دلداری کرتے۔ یا اپنے کسی بھائی کے ساتھ صلہ رحمی کرتے یا اپنے کسی بھائی کی حاجت براری کرتے تھے، جب رات ہو جاتی تو پوری رات کو تلاوت و نماز کے لئے فارغ کر لیتے تھے۔ بس یہی طریقہ آخر زندگی تک رہا، یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی یہ استاد بھی کیسے بہترین استاد ہیں اور ان کے شاگرد بھی کیسے بہترین شاگرد ہوں گے۔

حدیث میں امام زفر کے شیوخ میں سے سلیمان اعمش، یحییٰ بن سعیدؒ انصاری، محمد ابن اسحاقؒ صاحب المغازی، یحییٰ ابن تیمی، ایوب سختیانی، سعید بن عروبہؒ وغیرہم ہیں۔

امام زفر کے تلامذہ میں سے عبداللہ ابن مبارکؒ، حکم ابن ابراہیمؒ، محمد ابن حسنؒ، وکیع ابن جراحؒ، سفیان ابن عیینہ، ابو علی عبید اللہ بصریؒ، محمد ابن عبداللہ انصاریؒ، ہشام ابن حکمؒ، نعمان ابن عبد السلامؒ وغیرہم ہیں۔

لونڈی کا دیا ہوا لقب

امام طحاویؒ روایت کرتے ہیں کہ ابو عاصم امام زفر کے پاس بہت زیادہ آیا جایا کرتے تھے، ایک دوسرا بھی امام زفرؒ کے پاس آیا کرتا تھا۔ یہ ذرا پراگندہ حال تھا، اس کی کنیت بھی ابو عاصم تھی، ایک دن یہ ابو عاصم نبیل امام سے ملنے ان کے گھر پر تشریف لائے، دروازہ پر دستک دی نے پوچھا آپ کون ہیں، انھوں نے کہا کہ میں ابو عاصم ہوں، یہ کنیز مولا امام زفر کے پاس آئی اور کہا کہ دروازہ پر ابو عاصم کھڑے ہیں زفرؒ نے فرمایا دونوں ابو عاصم میں سے کونسے ابو عاصم ہیں؟ کنیز بولی النبیل ہیں۔ پھر کنیز ان ابو عاصم کو بلالائی، امام زفرؒ نے فرمایا ابو عاصم آج میری کنیز نے آپ کو ایک ایسا لقب دیا ہے جو لقب آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ کبھی بھی جدا نہ ہوگا، اس نے آپ کو نبیل لقب دیا ہے ابو عاصم کہتے ہیں اس کے بعد سے میرے لئے یہ لازم ہوگیا (نبیل عربی زبان میں شریف کو کہتے ہیں)

امام زفر کے ارشادات اور مسائل کے جوابات

ابو عاصم النبیل روایت کرتے ہیں کہ امام زفر نے فرمایا

تَعَدَّ قَبْلَ وَقْتِهٖ ذَلَّ (جو شخص وقت آنے سے پہلے درس کی سند پر بیٹھے گا، وہ آخر کار ذلیل ہوگا ابو عاصم النبیل فرماتے ہیں

(بقیہ ص ۶۰)

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے ارسال فرمایئے)

[کت]اب الرسالۃ

تصنیف : امام محمد بن ادریس شافعیؒ ۔ ترجمہ اردو مفتی [محم]د امجد علی صاحب ۔ یکے از اشاعت ادارۂ تحقیقات اسلامی [نا]شر محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ [کرا]چی ۱ ۔ ٢٠×٢٦ کے ٢٥٢ صفحات ، کاغذ اور کتابت [عم]دہ ، طباعت متوسط ۔

قیمت مجلد مع گرد پوش دس روپے پچاس پیسے

یہ امام شافعیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "الرسالۃ" [کا ا]ردو ترجمہ ہے ۔ "الرسالۃ" ہی وہ کتاب ہے جس کی وجہ [سے] امام شافعیؒ کو اصولِ فقہ کا بانی کہا جاتا ہے ۔ اس کتاب [میں] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی بار وہ اصول و قواعد قلمبند [فر]مائے ہیں جن کی روشنی میں قرآن و سنت سے احکام و عقائد کا [ا]ستنباط کرنا ضروری ہے ۔ یہ اصول اگرچہ بنیادی طور پر [ہر م]جتہد نے پیش نظر رکھے ہیں ، لیکن انھیں پہلی بار مدون کرنے کا [سہ]را امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے سر ہے ، اس کتاب میں [اما]م صاحبؒ نے سنت اور اجماع کی حجیت پر خصوصیت [س]ے بڑی مفصل اور سیر حاصل بحث فرمائی ہے ۔ کیونکہ یہی و[ہ م]قام ہے جہاں ٹھوکر لگ جائے تو غیر متنا ہی گمراہیوں کا [در]وازہ کھل جاتا ہے ۔

یہ کتاب دراصل امام شافعیؒ کا عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے نام ایک خط ہے (مقدمۃ الرسالۃ ص ١١ مصطفی البابی مصر ۱۳۵۸ھ بحوالہ الانتقار للحافظ ابن عبدالبر ص ٧٢ و ٧٣) جو امام شافعیؒ نے تصنیف کے موجودہ طریقہ کے بجائے بطور املاء اپنے شاگرد حضرت ربیع بن سلیمانؒ کو لکھوایا تھا ، اسی لئے اس کا انداز بیان اصل عربی میں بھی خاصا مشکل ہے ، فاضل مترجم نے اس مشکل پر خوبی کے ساتھ قابو پایا ہے ، جن مقامات پر ہم نے ترجمہ کو اصل سے ملا کر دیکھا ، ترجمہ صرف اچھا ہی نہیں بہت اچھا نظر آیا ، خوبی کی بات یہ ہے کہ بیشتر مقامات پر مترجم نے الفاظ کی پابندی پر کافی زور دیا ہے ، یہی وجہ ہے کہ جہاں اصل کتاب کی عبارت مجمل و پیچیدہ ہے وہاں ترجمہ بھی ایسا ہی ہے اور ایسی بنیادی کتابوں میں ترجمہ کی درستی کیلئے یہ بات بہت ضروری ہوتی ہے ۔

البتہ ص ٢٢٨ پر تدلیس کے بارے میں لکھا ہے ۔

"یہ عیب کذب بھی نہیں تصور کیا جا سکتا ، تاہم اس کی حدیث کو رد کر دیں ۔"

اس میں خط کشیدہ جملہ کا ترجمہ صحیح نہیں ہوا ، بلکہ اس سے بالکل الٹا مفہوم نکل سکتا ہے ، صحیح ترجمہ یہ ہونا چاہیے :

"کہ ہم اس کی حدیث کو رد کر دیں ۔"

اصل میں نَرُدُّ حَدِیثَہٗ کے الفاظ ہیں (ص ٣٧٩)

کہیں کہیں قوسین میں تشریح کے لئے الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں، لیکن ان اضافہ شدہ الفاظ میں جتنی احتیاط ضروری تھی بعض مقامات پر اتنی احتیاط ملحوظ نہیں رہی، مثلاً ص ۱۵ پر لکھا ہے:۔

"لہٰذا جس سنّت کی شان یہ ہوگی جو میں نے
بیان کی (یہاں) جو سنّت (جاریہ سامنے ہوگی)
اس کو جاری رکھا جائے گا"

یہاں اصل عربی عبارت یہ ہے:

"وکل ما کان کما وصفتُ اُمضِیَ علیٰ ما سنّہٗ"

اور دو نسخوں میں "سنّۃ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم" کے الفاظ ہیں (ملاحظہ ہو الرّسالۃ ص ۲۱۵ بتحقیق احمد محمد شاکر مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۵۸ھ مع حاشیہ)

لہٰذا سنّت کے ساتھ "جاریہ" کا جو لفظ مترجم نے قوسین میں بڑھایا ہے وہ نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ موجودہ دور میں گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ اس سے ذہن اس "سنّتِ جاریہ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کی "دریافت" چودھویں صدی میں بعض "محققین" کو ہوئی ہے، خاص طور سے یہ احتیاط اس لئے بھی ضروری تھی کہ "الرّسالۃ" کا یہ ترجمہ انہی "محققین" کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے جنہوں نے "سنّت جاریہ" کی اصطلاح کے یہ معنیٰ دریافت کئے ہیں۔

بعض لفظی فروگذاشتیں بھی نظر پڑیں، مثلاً ص ۲۵۸ پر جگہ جگہ "مخابرہ" کو "بیع مخابرہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ "مخابرہ" بیع ہرگز نہیں ہے، اور آج تک شاید کسی نے بھی اس کے لئے "بیع" کا لفظ استعمال نہ کیا ہو۔ خود فاضل مترجم نے حاشیہ پر اس کی جو تشریح کی ہے، وہ بھی "بیع" کی تعریف میں نہیں آتی۔

کہیں کہیں فاضل مترجم نے تشریحی حواشی کا مفید اضافہ فرمایا ہے، البتہ ص ۲۲۸ پر "تدلیس" کی تعریف کرنے کے بعد اس کی مثال میں "حدثنی" اور "سمعت فلان(؟)" بقول" ذکر کیا ہے، یہ مثال درست نہیں ہے۔ مدلس اگر ان الفاظ کے ساتھ روایت کرے تو اس کی روایت باتفاق مقبول ہوتی ہے، کیونکہ راوی کے ثقہ ہونے کی بنا پر ان الفاظ میں تدلیس کا احتمال نہیں ہوتا، تدلیس تو "عن" کے لفظ ہی سے ہو سکتی ہے۔

اس کتاب پر پیش لفظ جناب تنزیل الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ نے لکھا ہے جس میں "الرّسالۃ" کا تعارف کرایا گیا ہے، تعارف کے آخر میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"مدارس عربیہ میں صرف حنفی (یا شیعی) فقہ پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، نتیجہ کے طور پر ہمارے فارغ التحصیل طلبہ اور مدرسین حنفی (یا شیعی) فقہ کے ایک مختصر سے جزو کو پڑھ پڑھا کر خود کو اسلامی فقہ کا ماہر اور عالم سمجھ بیٹھتے ہیں ... یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے علماء محض روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں سطحی اور غیر تحقیقی مطالعہ کی بنیاد پر سرسری انداز میں حنفی نقطۂ نظر کے سوائے دیگر فقہی مکاتیب کے اصول و قواعد اور تفصیلات سے یکسر بیگانہ اور ناآشنا ہیں" (ص ۸)

واقعات کی اس غیر حقیقت پسندانہ تصویر کشی اور جملوں کے آ[illegible] تیور پر ہم کسی تبصرہ کی اس لئے ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ برادر محترم جناب تنزیل الرحمٰن صاحب فقہ کی وادی میں نووارد ہیں، یہ جوش و خروش طبعی امر ہے، یوں بھی موجودہ زمانہ میں "تحقیق" کا ایک لازمی جزو بلکہ اس کی لازمی شرط یہ بھی ہے کہ دینی مدارس کے علماء کو از اول تا آخر غیر محقق قرار دیا جائے لہٰذا اس فریضہ کی ادائیگی کے بغیر وقت کے تقاضوں کا پورا ہونا مشکل تھا۔

بہرکیف! بحیثیت مجموعی اس کتاب نے اردو زبان کے ذخیرہ میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے، البتہ اتنی گذارش ضروری ہے کہ جو حضرات براہِ راست عربی کتب اور اسلامی علوم سے استفادہ نہیں کر سکتے وہ صرف اس ترجمہ کو دیکھ کر دینی مسائل میں کوئی رائے قائم نہ فرمائیں کیونکہ یہ کتاب علمی انداز بیان اور علمی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہے جو بہت سے مقامات پر عام بادی النظر مفہوم سے مختلف بھی ہو سکتی ہیں۔　(م - ت - ع)

سلام کی نشاۃِ ثانیہ

مرتبہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

ائع کردہ دارالاشاعۃ الاسلامیہ، متوسط سائز کے ۵۲ صفحات
ابت و طباعت متوسط، کاغذ رف، قیمت ایک روپیہ

یہ کتابچہ دو مضامین پر مشتمل ہے پہلے مضمون کا عنوان ہے "اسلام
نشاۃِ ثانیہ اور کرنیکا اصل کام" مضمون نگار جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
یر ماہنامہ میثاق لاہور ہیں، اسمیں موصوف نے عالم اسلام پر مغرب
ے فکری استیلاء کا بڑی سلامتِ فکر کے ساتھ مختصر مگر جامع جائزہ
یا ہے اور اس کے بعد موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے راہ
ل تجویز کی ہے، جس کام کی طرف موصوف نے توجہ دلائی ہو
ہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اگر وہ صحیح ہاتھوں
ے ہو، اور اسے سنجیدگی کے ساتھ انجام دیا جائے تو
ا شبہ عہدِ حاضر کی بہت سی بیماریوں کا مداوا ہو سکتا
ہے۔

دوسرا مضمون جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا
ہے جس میں مغربی افکار کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، اور
غرب میں فلسفہ کے جو مکاتب فکر اس وقت رائج ہیں ان کا
عارف کرایا گیا ہے — دونوں مضامین فکر انگیز ہیں
ور عوام و اہل علم دونوں کے لئے مفید۔ (م۔ ت۔ ع)

ردّ بہتانِ قادیانی

مصنفہ پادری عبدالحق صاحب
سابق پروفیسر نارتھ انڈیا

ھیالوجی کل کالج۔ بنگلہ ۲۶ سیکٹر ۱۹-اے چنڈی گڑھ انڈ
ور حضرت مارٹن انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس ۱۳۲ لکھنؤ یوپی
نڈیا۔ ضخامت ۴۸ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت
مدہ، قیمت ۷۵ پیسے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب انجام آتھم
ں بائبل پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس کی رو سے حضرت مسیح
لیہ السلام کی تین دادیاں اور نانیاں زناکار ٹھہرتی ہیں
ادری عبدالحق صاحب نے (جو برصغیر کے مشہور عیسائی پادری
یں) یہ رسالہ مرزا غلام احمد قادیانی کے اس اعتراض کے جواب
میں لکھا ہے۔ ہمارے پاس یہ رسالہ بعض عیسائی حضرات نے
غالباً اس لئے بغرض تبصرہ بھیجا ہے کہ ہماری حیثیت مذکورہ
بالا فریقین کے درمیان یقینی طور سے غیر جانبدار کی ہے، چنانچہ
اپنی اسی حیثیت میں ہم اس رسالہ کے بارے میں چند معروضات
ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

پادری عبدالحق صاحب نے سب سے پہلے تو یہ لکھا ہے کہ:

"کلام مقدس کی رُو سے تو خدا کی بادشاہت
میں داخل ہونے کے ساتھ جسمانی نسب ناموں کا
کوئی تعلق ہی نہیں۔" (ص ۱۸)

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ آباؤ اجداد کے گناہوں کا
عذاب ان کی اولاد کو نہیں دیا جا سکتا[1]۔ لیکن اس کے باوجود
"پاکیزگی نسب" ایک قابل تعریف صفت ہے، اور چونکہ
حضرات انبیاء علیہ السلام چنے ہوئے اور مثالی انسان ہوتے
ہیں، اس لئے عادت اللہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پاکیزہ ترین نسب
کے خاندانوں میں مبعوث ہوئے ہیں۔ چنانچہ بائبل بھی اس کی
تصریح ہے کہ:

"کوئی حرام زادہ خداوند کی جماعت میں داخل
نہ ہو، دسویں پشت تک اس کی نسل میں سے
کوئی خداوند کی جماعت میں نہ آنے پائے۔"

(استثنا ۲:۲۳)

بلکہ انجیل متی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام
نے اپنے زمانے کے یہودیوں کو ان کے آباؤ اجداد کے گناہوں کی
بنا پر مورد الزام بھی ٹھہرایا حالانکہ وہ ان گناہوں سے اپنی
برأت کا اظہار کر چکے تھے، چنانچہ فرمایا کہ:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ
نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے
آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا
کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے
شریک نہ ہوتے اس طرح تم اپنی نسبت گواہی

---

[1] اگرچہ عیسائی حضرات کا عقیدہ کفارہ اس کے بھی خلاف ہے ۱۲

دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند
ہو، غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھر دو،
اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا
سے کیونکر بچو گے؟ (متی ۲۳: ۲۹ تا ۳۲)

پھر آگے پادری صاحب لکھتے ہیں:

"لیکن اگر مرزائی صاحبان نسب نامہ کے متعلق
اعتراض کرنا چاہیں تو ہم ان سے یہ مطالبہ کرنے
میں حق بجانب ہوں گے کہ پہلے ان کے کسی مسلّم
نبی کا صحیح اور کامل نسب نامہ پیش کرکے اس کے
آباؤ اجداد کی عصمت ثابت کر دکھاؤ، تب آنحضرتؐ
کے نسب نامہ پر حرف گیری کی جرأت کرو"۔
(ص ۱۹)

ماری رائے میں یہ اعتراض بھی بڑے مغالطے پر مبنی ہے، اس لئے
۔ "بے گناہی" ایک منفی (Negative) چیز ہے
ور نفی پر دلیل طلب کرنا کسی بھی اصولِ استدلال کے موافق نہیں ہے
نیا کا ہر شخص اپنی بے گناہی اس طرح ثابت کرسکتا ہے کہ اس کے
لاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا! لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ
بیا علیہم السلام کے نسب کو ہر غل وغش سے پاک ہونا چاہئے
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر کسی اعتراض کی کوئی معقول
جہ نہیں ہونی چاہئے، اسلام میں انبیاء علیہم السلام یا کسی بھی
غص کی نسب کی پاکیزگی ثابت کرنے کے لئے اتنی بات کافی ہو
۔ اس کے خلاف کوئی وجہ اعتراض موجود نہیں۔ ہاں اگر کسی
ے نسب میں کوئی وجہ اعتراض موجود ہو تو اس کا جواب
ینا اس شخص کے ذمے ہے جو ایک طرف نسب کی پاکیزگی کا
دعی ہو اور دوسری طرف اس وجہ اعتراض کو بھی حق تسلیم کرتا ہو

آگے پادری صاحب نے دو صفحوں میں یہ دلیل پیش
کی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے
ت پرست ہونے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان
جروح نہیں ہوتی، اسی طرح اگر حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب
میں کوئی شخص (معاذ اللہ) بدکار ہو تو اس سے حضرت مسیحؑ کی
شان میں کوئی فرق نہیں آتا ۔۔۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ قیاس
بھی درست نہیں، اس لئے کہ بت پرستی آزر کا ذاتی فعل تھا
جس کا کوئی اثر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت یا ان کے
نسب پر نہیں پڑ سکتا، اس کے برعکس زنا ایک ایسا فعل ہے
جو صرف جرم کے فریقین ہی کو مجروح نہیں کرتا، بلکہ اس کا لازمی
اثر ان کی اولاد کی شرافت نسب پر پڑتا ہے۔ کسی بت پرست کا
بیٹا اگر سچا عیسائی ہو تو آپ اسے ہرگز مطعون نہیں کرتے لیکن
اگر کوئی شخص ولد الزنا ہو تو اس کے بارے میں آپ کی بائبل
کا فتویٰ یہ ہے کہ:

"کوئی حرام زادہ خداوند کی جماعت میں داخل
نہ ہو، دسویں پشت تک اس کی نسل میں سے
کوئی خداوند کی جماعت میں نہ آنے پائے"
(استثناء ۲۳: ۲)

اس ابتدائی بحث کے بعد صفحہ ۵۵ سے پادری صاحب
نے حضرت مسیح علیہ السلام کی ان تین نانیوں کا ذکر کیا ہے جن
پر مرزا غلام احمد قادیانی نے فاحشہ ہونے کا الزام لگایا ہے
ان میں سے پہلی نانی تمر ہیں۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ یہوداہ بنی اسرائیل کے جدِ امجد اور
حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے صاحبزادے کا نام ہے
اور ان پر موجودہ بائبل میں یہ تہمت لگائی گئی ہے کہ انہوں نے
اپنے بیٹے کی بیوی کو طوائف سمجھ کر اس کے ساتھ (معاذ اللہ)
زنا کیا (پیدائش ۳۸: ۱۲ تا ۱۸) اور اسی زنا کے حمل سے
فارض نامی ایک لڑکا پیدا ہوا (پیدائش ۳۸: ۲۹) اسی
فارض کی نسل سے حضرت مسیح علیہ السلام کا پیدا ہونا انجیل متی
میں بہ تصریح بیان کیا گیا ہے (متی ۱: ۳)

اس اعتراض کا جواب پادری صاحب نے پہلے تو یہ
دیا ہے کہ:

"یہوداہ کو ہم بستری کے وقت یہ معلوم نہ تھا

کہ وہ اس کی اپنی بہو ہے، سوائے ایک دفعہ کے
پھر کبھی یہوداہ اس سے ہمبستر نہ ہوا۔" (ص ٥٥)

آپ خود غور فرمالیجئے کہ یہ جواب کتنا معقول ہے؟ سوال یہ ہے کہ اگر بہو کے سوا کسی اور عورت سے زنا کیا جائے اور صرف ایک مرتبہ کیا جائے تو کیا اس سے پیدا ہونے والی اولاد غیر ثابت النسب نہیں ہوگی؟

پھر پادری صاحب دوسرا جواب یہ دیتے ہیں کہ:

"اس وقت تک شریعت موسوی نازل نہ ہوئی تھی، اور لامحالہ جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا۔
(رومی ٥: ١٣) - (ص ٥٥)

غالباً پادری صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس وقت زنا حرام نہیں تھا، لیکن ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ بائبل میں جہاں یہوداہ کے بارے میں یہ من گھڑت قصہ لکھا ہوا ہے وہیں اس کی بھی تصریح ہے کہ شریعت موسوی کی طرح اس زمانے میں بھی اگر کوئی کاہن کی بیٹی زنا کرتی تو اس کی سزا اسے نذر آتش کرکے دی جاتی تھی اس لئے کہ بائبل میں یہوداہ کا مذکورہ قصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"تین مہینے کے بعد یہوداہ کو یہ خبر ملی کہ تیری بہو تمر نے زنا کیا اور اسے چھنالے کا حمل بھی ہے، یہوداہ نے کہا کہ اسے باہر نکال لاؤ کہ وہ جلائی جائے۔" (پیدائش ٣٨: ٢٤)

اس سے معلوم ہوا کہ زنا سے متعلق یہوداہ کے زمانے میں بھی احبار (٢١: ٩) کا قانون نافذ تھا۔

دوسری نانی جن کی وجہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کے مبینہ نسب نامے پر اعتراض کیا گیا ہے، راحب ہیں جن کے "کسبی" ہونے کی تصریح کتاب یشوع (٢: ١) میں موجود ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے پادری صاحب ص ٥٥ پر لکھتے ہیں:

"راحاب نے اپنی گذشتہ حالت کو بالکل ترک کرکے اپنے گھرانے سمیت خدا کے برگزیدہ قوم بنی اسرائیل کے درمیان بود و باش اختیار کی
(یشوع ٦: ٢٥)

لیکن اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ راحب نے توبہ کرلی تھی (جس کی کوئی تصریح بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں موجود نہیں ہے) تب بھی اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس سے جو اولاد کسبی ہونے کی حالت میں پیدا ہوئی وہ ثابت النسب بن گئی؟

لہٰذا ان دو نانیوں کی بنیاد پر اگر حضرت مسیح علیہ السلام کے بائبل کے بیان کردہ نسب نامے پر اعتراض کیا جائے تو ہمارے نزدیک وہ بالکل درست ہوگا۔

البتہ تیسری نانی یعنی بت سبع کی بنیاد پر اگر کسی نے کوئی اعتراض کیا ہے تو وہ درست نہیں، اور اس کے جواب میں پادری عبدالحق صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ بائبل کی رو سے:

جس وقت سلیمان پیدا ہوا (٢ سموئیل ١٢: ٢٤) اس وقت وہ داؤد کی جائز بیوی تھی" (ص ٥٨)

آخر میں یہ وضاحت کردیں کہ ہمارے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم رض کا نسب بالکل پاک صاف اور بے داغ ہے اور بائبل کے جن مذکورہ بیانات سے اس کے خلاف کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو ان سے حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب کے بجائے خود بائبل مجروح ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بائبل کی کتابیں بیشمار غلطیوں اور اختلافات سے بھری ہوئی ہیں۔ اور تاریخی لحاظ سے نہ ان کی کوئی متصل سند ہے، نہ ان کا قابل اعتماد ہونا کسی قابل لحاظ علمی دلیل سے ثابت ہوسکا ہے۔ اس کے برعکس ان میں حذف و اضافہ اور ترمیم و تحریف کے ناقابل انکار شواہد موجود ہیں جو اب علمی دنیا میں ڈھکے چھپے نہیں رہے لہٰذا بائبل پر اس قسم کے اعتراض کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ یہ اعتراض اس انداز میں بیان نہ کریں کہ ان سے واقعۃً حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب یا اخلاق پر معاذ اللہ کسی طعن کا وہم پیدا ہوتا ہو۔

(م - ت - ع)

بال کی کھال
نکالنا
مارا ہی کام ہے
ABC

پبلیشر: مفتی محمد شفیع۔ دفتر البلاغ کراچی نمبر ۱۴
پرنٹر: مستفیض احمد صدیقی۔ انٹرنیشنل پریس کراچی۔